مولانا عبدالماجد دریابادیؒ
کی
صحافتی خدمات

ارشاد سہیل عمری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ
کی
صحافتی خدمات

مصنف

ارشاد سہیل عمری

کتاب کا نام : مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات
موضوع : تحقیق وتنقید
مصنف : ارشاد سہیل عمری
سن اشاعت : جنوری 2014ء
تعداد اشاعت : 500
صفحات : 183
قیمت : Rs. 100/-
کمپوز وتزئین : سہیل گرافکس، سعید آباد، حیدرآباد Ph: 9246161020

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ

دارالکتاب، روبروسٹی سیول کورٹ، چھتہ بازار۔ ۲ فون:7396189931

مصنف کا پتہ

مکان نمبر:16-2-867/A/4، جیون یار جنگ کالونی، سعید آباد، حیدرآباد۔59 (اے پی)
Email: irshad.suhail@gmail.com, Cell: 9246161020

انتساب

رفیقِ حیات

صفورہ گوہر

کے نام معنون

فہرستِ مضامین

مضمون | صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ گفتار

الحمدللہ رب العٰلمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الامین (ﷺ)

آسمان اردوصحافت پر عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء) کا نام صرف ایک تاباں ودرخشندہ ستارے کی نہیں بلکہ آفتابِ تازہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ان سے پہلے اور بعد میں نہ جانے کتنے ادیب اور صحافیوں نے چمنِ ادب وصحافت کی اپنی اپنی بساط کے موافق آبیاری کی مگران کے ذریعہ یہ چمن اتنا ہرا بھرا نہ ہوسکا جتنا کہ تنہا عبدالماجد دریابادی کی کاوشوں سے ہوا۔مولانا اپنے خونِ جگر سے اردوصحافت کے چمن کو سینچا اوراسے شاداب کیا۔ عبدالماجد دریابادی بیسویں صدی کے وہ واحد صاحبِ طرز صحافی ہیں جن کا نام، ادب اور صحافت کی دنیامیں ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ لیا جائے گا۔انہوں نے ایک طرف تو اسلامیات اورقرآنیات کے باب میں بیش بہا خدمات انجام دی تو دوسری طرف انہوں نے فلسفہ ونفسیات اورصحافت وادب کے دیگر گوشوں کو بھی اپنے قیمتی رشحاتِ قلم سے مالا مال کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت یوں تو بڑی پہلودار تھی۔صحافت، فلسفہ ادب اور مذہب کے مختلف شعبوں میں انہوں نے قابلِ رشک تصنیفات یادگار چھوڑیں۔سوانح، سفرنامے، ترجمے، تفسیر اورتذکیرے میں سے شاید ہی کوئی صنف ایسی بچی ہوجس میں ان کے قلم نے جولانی نہ دکھائی ہو۔تاہم ان تمام حیثیتوں پر صحافتی حیثیت غالب تھی۔اردوصحافت کی تاریخ

میں یہی کچھ کم نہیں کہ انہوں نے باون (۵۲) سال تک صحافت کی خدمت انجام دی۔ ہفتہ وار ''سچ'' اور ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' میں مولانا عبدالماجد کے شذرات بلا مبالغہ ''ادب پارے'' ہیں۔ مغربی تہذیب وتمدن پر طنز کرنے کے باب میں وہ ''نثر کے اکبرالہ آبادی'' ہیں۔ انہوں نے طنز وتنقید میں جس جرأت، حق گوئی اور عزیمت کا مظاہرہ کیا اس نے ان کے کردار کو چار چاند لگادیئے ہیں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو، مل گیا

مولانا عبدالماجد کے اسلوب میں رقت سامانی، حزن آفرینی اور عبرت زائی کے عناصر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی، رعنائی، سلاست بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ موضوع جیسا بھی ہو، وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی، طرز ادا کی دلآویزی کے ذریعہ اس میں قوت وتاثیر پیدا کردیتے تھے۔ ان کی نثر کا ہر پہلو اپنے اندر بے پایاں دلکشی رکھتا ہے۔ بقول نظیریؔ

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مولانا عبدالماجد دریابادی کے علم، فلسفہ، ادب، قابلیت اصولوں اور اوران کی اہلیت کا ہر کوئی معترف تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں۔ وہ ایسی شخصیت تھی جس نے بچپن ہی سے علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی ماحول میں اپنا وقت گذارا تھا اور کم عمری ہی سے انھیں مضامین لکھنے کا اور مطالعہ کا شوق تھا۔ اسی شوق نے ان کی زندگی میں کبھی قلم سے، کبھی اپنے علم سے اور کردار سے اپنے دور کے مشہور اصحاب علم ودانش کو اپنی جانب متوجہ کرایا۔ اُن کی تصانیف، تالیفات و تراجم کی ایک طویل فہرست ہے۔ انہوں نے ادبی موضوعات پر تقریباً 10 کتابیں، آپ بیتی کے عنوان سے 9 کتابیں، فلسفہ ونظریات پر 9 تصانیف، 4 سفرنامے، مذہبیات اور متعلقات

پر تقریباً 15 کتابیں، خطبات کے مجموعے :6 کتابیں، تراجم و تالیفات، 10 مرتبات و مکتوبات :10 کتابیں اور انگریزی میں مترجم قرآن کریم اور قرآن کریم کی تفسیر کے علاوہ کتابیات میں 6 کتابیں اور رسائل کے خاص نمبر وغیرہ۔ اس طرح انہوں نے تقریباً 80 سے زاید کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے جہاں اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ تصنیف و تالیف میں لگایا، وہیں انہوں نے قومی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ اگر چہ کہ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن سیاست سے لاتعلق بھی نہیں رہے۔ انہوں نے عملی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ اس زمانہ کے حالات کے حساب سے وہ اپنے آپ کو سماجی، سیاسی مسائل اور تحریکات سے دور بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریک نے زور پکڑا تو اس وقت مولانا عبدالماجد بھی اس کے جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونے لگے۔ اس دور کی سیاسی شخصیت مولانا محمد علی جوہر سے وہ پہلے سے بھی متاثر تھے، ان کی معیّت میں انہوں نے اپنے سیاسی سفر کو شروع کیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے اور مخالفین کے جواب میں ان کی تحریریں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ عدم تشدد کی افادیت کے لیے انہوں نے قرآن کریم کو رہنما اور سند بنا کر ''ماڈرن ریویو'' میں ''اسلام اور ستیہ گرہ'' کے عنوان سے مضمون لکھ کر ثابت کیا کہ ستیہ گرہ کی تعلیم اسلام کی امن پسندی سے کوئی الگ چیز نہیں۔

مولانا موصوف کے یہی وہ امتیازات اور خصوصیات ہیں جو راقم الحروف کو ہمیشہ کسی مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچتے رہے۔ ابتداء میں مجھے مولانا محترم کی تحریروں سے خاص شغف تھا۔ ان کی تحریروں کی شگفتگی اور رعنائی ہمیشہ میرا دل موہ لیتی تھی۔ اس لیے میں نے ان کی حیات و خدمات کا نہ صرف مکمل مطالعہ کیا بلکہ ان پر کیا گیا کام کا بھی جائزہ لیا۔ لیکن مولانا عبدالماجد جیسی عظیم المرتبت اور جامع الکمالات شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خصوصاً ان کی صحافتی زندگی گوں ناگوں خصوصیات کی جامع تھی۔ ان کی تحریریں دینی،

اخلاقی، علمی، ادبی، فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی موضوعات پر محیط ہوتی تھیں۔ ان میں فکر و تدبر، تذکیر و موعظمت اور بصیرت کے بیش قیمت عناصر ہوتے تھے۔ ان سب کی اہمیت و افادیت کو اُجاگر کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ جب کتاب کی تیاری کے لیے قلم اٹھاتا ہوں اور مولانا کے اخبارات پر نظر ڈالتا ہوں تو کانوں میں یہ صدا آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

تاہم ذوق نے رہبری کی، جستجو نے اس راہ کی رکاوٹوں کو آسان کیا، کرم فرماؤں کا تعاون اور دعائیں رفیق سفر رہیں اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی۔ تب ہی جا کر یہ کتاب بحسن خوبی پائے تکمیل کو پہنچی۔

میں نے اس کتاب کو (۶) چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب کی سرخی ''عبدالماجد دریابادی: حیات و شخصیت'' ہے یہ دو حصوں پر مشتمل ہے حصہ ''الف'' میں سوانح اور حصہ ''ب'' میں شخصیت کو رکھا گیا ہے۔ سوانح کے حصہ میں عبدالماجد دریابادی کے وطن مالوف، خاندانی پس منظر، والد و والدہ ماجدہ اور عبدالماجد کی پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت، پھر اعلیٰ تعلیم، ملازمت شادی و اولادیں اور وفات کے علاوہ مذہب و عقیدہ، مضمون نویسی و صحافت سے وابستگی ان کی مکمل تصنیفات کی فہرست اور اعزازات وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ شخصیت کے حصہ میں مولانا عبدالماجد کا حلیہ، لباس، وضع قطع عادات و اطوار اور ان کا نصب العین اور نظریہ فکر کو شامل کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات'' ہے۔ اس میں مولانا کی صحافتی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتداء میں صحافت کی اہمیت، ہندوستان میں صحافت کا آغاز و ارتقاء، ہندوستان کی صحافتی فضا، جس کے ماحول میں مولانا کے اشہبِ قلم نے چلنا سیکھا، مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز، اخبار ''سچ'' کی اجرائی، سچ کی خصوصیات اخبار ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کی اجرائی اور خصوصیات کے علاوہ مولانا عبدالماجد کے نظریہ صحافت کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب ''عبدالماجد دریابادی کی کالم نگاری'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ کالم نگاری فن صحافت کا ایک اہم حصہ ہے، آج کل ہر مشہور اخبار میں ایک طنزیہ ومزاحیہ کالم کا ہونا ضروری سمجھا جارہا ہے، جس کے تحت ادیب حضرات مختلف عصری مسائل وواقعات اور سیاسی وسماجی، پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ چوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی اپنے خاص اسلوب میں اس قسم کے کالم آخری وقت تک تحریر کرتے رہے ہیں، اس لیے اس باب میں ان کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں فن کالم نگاری کی تعریف وتوضیح کرتے ہوئے ضمناً اردو کے مشہور کالم نگاروں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کے کالموں کو معرضِ بحث میں لایا گیا ہے اور ان کے کالموں کی خصوصیات اور امتیازات کو اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

چوتھا باب ''عبدالماجد دریابادی کی صحافت کا تنقیدی جائزہ'' اس میں ان کی اچھی منتخب صحافتی تحریروں اور شہ پاروں کی قدر وقیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پانچواں باب ''عبدالماجد درآبادی کی صحافت کا اسلوب''۔ جب تک عبدالماجد دریابادی کی تحریروں کے اسلوب کو نہ سمجھا جائے اس وقت تک ان کی صحافت کی اہمیت و افادیت کا سمجھنا محال ہے۔ اس لیے پانچویں باب میں ''عبدالماجد درآبادی کی صحافت کا اسلوب'' کے تحت ان کے کالموں کے طرز بیان اور اسلوب کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کے منفرد امتیازات وخصوصیات کو واضح کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے۔

چھٹا باب ''مجموعی جائزہ'' ہے۔ اس کے تحت اس کتاب کے اہم مباحث کو سمیٹتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافتی تحریروں اور ان کی خدمات پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ صحافت کے حوالے سے بہ اک نظر مولانا کی تصویر فتاری کی ذہن وفکر میں سما جائے۔

الغرض یہ کتاب اردو صحافت سے دلچسپی رکھنے والے، خصوصاً ادب کا صحیح نظریہ رکھنے والے اصحاب ذوق حضرات کے لیے ایک مفید معلومات کا ذخیرہ ہے۔ کتاب ہذا نہ صرف عبدالماجد دریابادی کی علمی وادبی اور صحافتی شخصیت کی قدر ومنزلت کو اجاگر کرتی ہے، بلکہ ان کے بعض نادر ونایاب پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ اہل علم سے التماس ہے کہ اس کتاب کی تسامحات سے مصنف کو واقف کروائیں اور اپنی آراء سے بھی نوازیں۔

آخر میں کلماتِ تشکر کے طور پر ہی نہیں بلکہ اپنا اخلاقی فریضہ سمجھ کر میں اپنے مادر علمی و مرکز ادبی ''جامعہ دارالسلام، عمرآباد'' کے تمام اساتذہ کے حق میں پُرخلوص ہدیۂ امتنان اور نذرانۂ تشکر پیش کرتا ہوں ہے۔ جن کی سرپرستی اور رہنمائی میں میرے قلم نے لکھنا سیکھا، علم و ادب کا ذوق وشوق ورثے میں ملا۔

والدین ماجدین کا ہر لمحہ احسان مند ہوں، جن کی کاوشوں اور دعاؤں کے فیض کی بدولت آج میں اس قابل بنا۔ ان کی محبتیں اور شفقتیں میری زندگی کے تاریک راہوں میں ہمیشہ نور ثابت ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ میرے بھائیوں کا تعاون بھی میرے زندگی کے مشکل مراحل میں ساتھ رہا ہے۔ میری اہلیہ جو شریکِ حیات کے علاوہ شریکِ غم وخوشی بھی ہے، کے ہمراہ زندگی کے ایام اس قدر تیزی سے گذر جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ میری دختران صبیحہ ارم، مدیحہ انم اور فرزند ارجمند حسان ثابت کے لیے اور ان سب کے لیے جو کسی نہ کسی حیثیت سے میری دست گیری یا ہمدردی کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دست بہ دعا ہوں کہ دنیا وآخرت میں فلاح وکامیابی ان کے قدم چومے، حکمت ودانائی اور رشد وہدایت سدا اُن پر سایہ فگن رہے۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

ارشاد سہیل عمری
حیدرآباد

۱۴ر جنوری ۲۰۱۴ء
۱۲ر ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

عبدالماجد دریابادی حیات و شخصیت

حصہ ''الف'' سوانح

حصہ ''ب'' شخصیت

حصہ ''الف'' سوانح

بیسویں صدی عیسوی میں جن بلند پایہ ادیبوں نے صحافت، فلسفہ، مذہب، انشاء پردازی، اور علم وادب کی مختلف وادیوں میں اپنے عہد آفرین اور لازوال کارناموں کی بدولت جریدہ عالم کے اوراق پر اپنے نام ومقام کے دوامی نقوش ثبت کئے ہیں، ان میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا نام امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔ ع

ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲-۱۹۷۷) بیسویں صدی کے ایک باکمال قلم کار اور اردو کے مشہور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ آپ بیسوں کتابوں کے مصنف، قرآن مجید کے مفسر، فلسفہ کے ترجمان، اخبار ''صدق'' کے مدیر اور صحافت کے روشن مینار تھے۔ جنہیں بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ''اس دور میں انہیں ادب وانشاء کے قلم رو کی حکمرانی ہی نہیں بلکہ اس عہد کی صاحبقرانی ملی تھی۔'' [1]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی زندگی مجموعۂ اضداد اور مجموعہ عجائبات تھی۔ آپ بیک وقت فلسفی بھی تھے، مفسر بھی۔ معلم اخلاق بھی تھے، مترجم بھی۔ مصنف بھی تھے، تنقید نگار

[1] مولانا معین الدین ندوی، ایڈیٹر ماہنامہ معارف، مولانا کے دوادبی شاہکار، مشمولہ فروغ اردو لکھنؤ، عبدالماجد نمبر، ص: ۱۲۳

بھی۔ شریعت کے دانا بھی تھے، طریقت کے بینا بھی۔ اور سب سے بڑھ کر اپنے دور کے سب سے بڑے ''طناز'' بھی تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی ہی وہ واحد اور نمایاں شخصیت ہیں، جن کے بے باک قلم نے مذہب، تصوف، تفسیر، ادب، صحافت، تنقید، نفسیات اور مغربی و مشرقی فلسفہ وغیرہ جیسے متنوع موضوعات پر ہزاروں صفحات کا قابل فخر سرمایہ فراہم کیا ہے۔ عبدالماجد دریابادی کی تصانیف، تراجم اور تالیفات کی تعداد کی برابر تو شاید دیگر مصنفوں سے بھی ہو جائے۔ لیکن اس قدر متنوع موضوعات پر کتابیں تصنیف کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ ہر کتاب سند اور حوالے کا مقام بھی حاصل کرلے، ایسا کم ہی ہوا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، کئی گوشے ہیں، کئی حیثیتیں ہیں۔ پیش نظر مقالے میں ان کے فکری نقوش اور علمی ارتسامات کے صرف ایک پہلو یعنی ان کی ''صحافتی خدمات'' کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس موضوع پر گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف کے سوانحی کوائف پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ ان کی شخصیت کا ہلکا سا خاکہ ذہن میں نقش ہو جائے۔

وطن:

اترپردیش کے ضلع بارہ بنکی میں ایک قبضہ ''دریاباد'' آباد ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو لکھنو سے ۴۳ میل جانب مشرق، فیض آباد سے ۴۱ میل جانب مغرب اور ضلع بارہ بنکی سے ۲۴ میل جانب مشرق واقع ہے۔ یہی دریاباد مولانا عبدالماجد کا مولد و وطن ہے۔ آپ کو اسی قصبہ کی طرف منسوب کر کے عبدالماجد دریابادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دریاباد

کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پندرہویں صدی میں شاہانہ شرقیہ جون پور کے عہد میں مولانا عبدالماجد کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ مخدوم محمد آ بکش (متوفی:۱۴۷۵ء) پڑوس کے قصبہ محمود آباد میں آئے وہاں سے شاہی عامل دریا خان انہیں اس خطۂ ویران میں لے آئے اور حضرت مخدوم نے ان کے نام پر قصبہ کا نام ''دریاباد'' رکھ کر اس کی بنیاد ڈالی۔ تاریخ بنیاد ۸۴۵ھ مطابق ۱۴۴۱ء ہے۔[۱]

خاندانی پس منظر:

مولانا عبدالماجد دریابادی ''قدوائی'' خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خاندان اپنے دور میں مشہور اور معزز تھا۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القصناۃ شیخ معزالدین تھے، جنہیں لوگ از راہ احترام ''قدوۃ العلم والدین'' کہتے تھے۔ قاضی قدوۃ اس کا مخفف ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ہارونؑ سے ہوتا ہوا حضرت یعقوبؑ سے جاملتا ہے۔ مشہور ہے کہ آپ سلطان محمود غزنوی کے ہم عصر تھے۔ وہ اندازاً دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے تھے اور اجودھیا ضلع فیض آباد میں مقیم ہو گئے۔ ان کی اولاد تعلیم وتبلیغ اور ذریعہ معاش کے سلسلے میں تمام اطراف واکناف میں پھیل گئی۔ ان کے خاندان کے لوگ آج بھی مختلف علاقوں میں موجود ہیں۔

قاضی قدوۃ کی نسل میں دس پشتوں کے بعد ایک بزرگ مخدوم شیخ محمد آ بکشؒ (متوفی: ۱۴۷۵ء) گذرے ہیں، جن کی گیارہوں پشت میں مفتی مظہر کریم تھے جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے حقیقی دادا تھے۔ دادا کے چار بھائی تھے۔

۱۔ مولوی کلیم نور کریم صاحب متوفی ستمبر ۱۸۷۱ء

[۱] عبدالماجد دریابادی آپ بیتی ص:۲۶، ۲۷

۲۔ مولوی مفتی مظہر کریم صاحب متوفی ۱۸۷۳ء
۳۔ مولوی حاجی مرتضیٰ کریم صاحب متوفی ۱۸۷۳ء
۴۔ مولوی کرم کریم صاحب متوفی ۸۷۹ء

ان میں حکیم نور کریم صاحب مولانا عبدالماجد دریابادی کے حقیقی نانا بھی تھے۔آپ اپنے زمانے کے مشہور طبیب بھی تھے۔''طبیب گر'' آپ کا لقب تھا۔آپ اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے دادا مفتی مظہر کریم کو انگریز حکومت نے باغیوں کی تائید کرنے کی پاداش میں جزائر انڈمان (کالا پانی) میں قید کر دیا تھا۔وہاں انہوں نے مشہور عربی لغت جغرافیہ مراصدالاطلاع علی اسماء الامکنتہ والبقاء (ازصفی الدین عبدالمومن) کا ترجمہ اردو میں کیا۔اس کے صلہ میں ان کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔اورآپ پونے سات سال بعد ۱۸۶۵ء میں وطن واپس آ گئے۔بقیہ عمر فتوی نویسی میں مشغول رہے۔ سن ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔

والد ماجد:

مفتی مظہر کریم کے سات اولادیں تھیں۔ان میں سب سے چھوٹے فرزند عبدالقادر تھے۔یہی مولانا عبدالماجد کے والد ماجد تھے۔سن ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور زمانے کے رسم ورواج کے مطابق لکھنو میں تعلیم وتربیت پائی۔عربی وفارسی میں دست گاہ کے ساتھ اردو کی استعداد بھی اچھی حاصل کر لی تھی۔علاوہ ازیں کثرت مطالعہ کے ذریعہ وہ عملاً عالم کے درجے میں آ گئے تھے۔آخری عمر میں انگریزی سے بھی واقف ہو گئے تھے۔وکالت کا امتحان پاس تھے لیکن اس سند سے کام نہ لیا۔اسکول سے ملازمت شروع کی۔ہردوئی میں نجی

طور پر کسی انگریز حاکم کو فارسی پڑھائی اس نے خوش ہو کر عدالت فوجداری میں سررشتہ داری دلا دی۔ اس سے ترقی کر کے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ اس زمانے میں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ ملازمت کی معراج سمجھی جاتی تھی۔

مولوی عبدالقادر اپنی ملازمت کے فرائض ریٹائر ہونے تک بحسن وخوبی انجام دیئے۔ سیتاپور میں مدتِ ملازمت ختم کر کے پنشن پائی۔ آپ بڑے بااخلاق، پابند صوم و صلوۃ نیک دل اور نرم خو بزرگ تھے۔ علمی صحبتوں کے بڑے شائق تھے۔ معلوماتی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق آخر تک رہا۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد مضمون نویسی کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ لکھنو کے مشہور اردو روزنامہ اودھ اخبار اور ہفتہ وار مشرق میں بھی مذہبی و نیم مذہبی موضوعات پر وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اپنی اہلیہ اور ایک لڑکی کو لے کر سفرحج بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔ الوداع کہنے کے لیے بمبئی تک عبدالماجد بھی ساتھ گئے تھے۔ (جو اُس دور میں مذہب بیزار تھے) وہ اُس وقت کے پُرسوز منظر کو الفاظ کا جامہ پہنا تے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''بمبئی تک یہ پیکر الحاد و فرنگیت بھی ساتھ گیا، جہاز کی روانگی میں برابر دیر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر واپس آنا پڑ گیا۔ پڑھائی کا جو ہرج ہو رہا تھا۔ رخصتی کے وقت والد مرحوم کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار جاری تھے۔ بالکل خلاف معمول اور آہ! کہ عالم آب و گل میں یہ آخری رخصتی تھی۔ میں شقی القلب و نادان اُن کی اس رقتِ قلب اور فطری بارش مہر کو حیرت سے دیکھتا اور بے محل سمجھتا رہا۔!'' [۱]

مولوی عبدلقادر حج کا فریضہ ادا کرنے کے بعد ۱۱ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۳ ۱۴ ۱۳/ کو عین فجر کی نماز کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

[۱] عبدالماجد دریابادی 'آپ بیتی' ص:۳۹

والدہ ماجدہ:

بی بی نصیر النساء نام تھا۔ لکھنو میں ۱۸۵۳ء کو ولادت ہوئی۔ مذہبی خیالات رکھنے والی نیک سیرت خاتون تھی۔ نماز اور قرآن مجید کی تلاوت پابندی سے کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ تہجد کا بھی خاص اہتمام کرتی تھیں۔ عبدالماجد دریابادی اپنی والدہ محترمہ کے بارے میں بڑے شوق سے رقمطراز ہیں۔

> ''شوق عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں، عمر طویل پائی اشراق و چاشت دونوں نمازوں کا کیا ذکر ہے! تہجد تک میرے علم میں ناغہ نہ ہونے پاتی اور ہمت کا کمال یہ تھا کہ شب کے اخیر حصہ میں نماز وقت فجر سے گھنٹہ پون گھنٹہ قبل اٹھنے کے بجائے عین درمیان شب میں اٹھ بیٹھتیں اور وضو کرکے چار یا آٹھ رکعتیں ہی نہیں پوری بارہ رکعتیں کھڑے ہوکر پڑھتیں اور پھر نماز فجر، اول وقت، منہ اندھیرے پڑھ ڈالتیں۔'' [۱]

یہ عبادت گزار، ہمدرد اور فیاض خاتون اپریل ۱۹۴۱ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔

بھائی بہن:

بھائی بہن کل پانچ تھے۔ لیکن دو کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ اور باقی دو عبدالماجد سے بڑے تھے۔ ایک بھائی کا نام عبدالمجید اور ایک بہن کا نام پہلے ظریف النساء رکھا گیا تھا پھر بارہ تیرہ سال کی عمر میں بدل کر بی بی سکینہ کر دیا گیا۔ سن میں وہ عبدالماجد سے پانچ چھ سال بڑی تھیں اور عبدالمجید آپ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ وہ بچپن ہی سے مرض خناق کے شکار تھے۔ جوں توں ۱۹۱۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ اُن کے بڑے لڑکے حکیم حافظ

[۱] عبدالماجد دریابادی آپ بیتی ص: ۴۴، ۴۵

عبدالقوی سے ایک کتاب ''ذکرِ مجید'' کے نام سے لکھوادی۔

عبدالماجد دریابادی کی پیدائش اورابتدائی تعلیم:

مولوی عبدالقادر کے چھوٹے بیٹے عبدالماجد تھے۔ان کی ولادت /۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء مطابق /۱۶ شعبان ۱۳۱۰ھ میں دریاباد میں ہوئی۔ ایک روایت /۱۵ مارچ کی بھی ہے۔ مالک رام کی تحقیق کے مطابق /۱۶ مارچ صحیح ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

> ''ہجری تقویم کی رو سے شعبان ۱۳۰۹ ء تھا۔ وہ خود تاریخ کبھی /۱۵ کبھی /۱۶ اور کبھی /۱۷ لکھتے رہے۔آخری مرتبہ ۱۶ لکھی تھی حسن اتفاق سے یکم مارچ بھی یکم شعبان کو تھی''۔[۱]

مسلم گھرانوں میں عام دستور کے مطابق پانچویں برس بسم اللہ کی رسم انجام دی جاتی تھی۔لیکن طے پایا کہ ان کی بسم اللہ چوتھے برس ہی کردی جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں گھر پر بسم اللہ کی رسم ادا ہوئی۔اس کے بعد ناظرہ قرآن مجید اور اردو فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں، جن میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں، گلستاں، بوستاں اور سکندر نامہ قابل ذکر ہیں۔امام غزالی کی مشہور کتاب ''کیمیائے سعادت'' کے اکثر اجزا بھی ختم کر لیے تھے۔عربی زبان میں شد بد پاتے ہی مدرسے میں داخل ہو گئے۔اور وہاں عربی بطور مضمون لے لی۔ تقریباً ۱۲ سال کی عمر میں سیتا پور کے ہائی اسکول میں بغرض تعلیم داخلہ پایا۔ یہاں خوش قسمتی سے لکھنو کے قابل اور ذی استعداد عالم استادوں کی شاگردی نصیب ہوئی۔ان میں شیعہ عالم حکیم محمد ذکی مرحوم اور مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی قابل ذکر ہیں۔عربی زبان میں مہارت انہیں کے فیضانِ علم کا نتیجہ ہے۔

علم کا شوق شروع ہی سے تھا۔اس کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی قدرتی طور پر ودیعت

---

[۱] مالک رام، 'تذکرہ معاصرین' ص: ۱۸۴

ہوئی تھی۔اس لیے تعلیم کے تمام مراحل بڑی آسانی کے ساتھ طے کرتے چلے گئے۔ ۱۹۰۷ء میں سیتا پور ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔حساب کے مضمون میں کچھ کمزور واقع ہوئے تھے،مگر اسکول کے ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی وال کی استادانہ شفقت کی وجہ سے دسویں جماعت کا امتحان سیکنڈ ڈویزن میں پاس کرکے اسکول کی تعلیم ختم کی۔

اعلیٰ تعلیم:

میٹرک کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے کیننگ کالج لکھنو میں داخلہ لیا۔اختیاری مضامین منطق،تاریخ اور عربی تھے۔انٹرمیڈیٹ کا امتحان سکنڈ ڈویزن میں پاس کیا۔کتابوں کا شغف مطالعہ سے لگاؤ شروع ہی سے تھا۔لکھنو میں کئی بڑی لائبریریاں تھیں خود کالج کی لائبریری بھی کافی بڑی تھی۔مولانا عبدالماجد کو لائبریریوں کی گشت کا چسکا لگ گیا تھا۔انہوں نے کالج کی لائبریری کے علاوہ دوسری لائبریریوں سے بھی خوب استفادہ کیا۔

جولائی ۱۹۱۰ میں اسی کالج میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔مضامین انگلش ٹیکسٹ،جنرل انگلش،فلسفہ اور عربی تھے بی۔اے کا امتحان سکنڈ ڈویزن میں کامیاب کیا۔دوران تعلیم ہی فلسفہ اور نفسیات میں نام وری حاصل کرچکے تھے اور ملک اور بیرون ملک کے انگریزی رسائل میں فلسفہ اور نفسیات پر مضامین لکھنے لگے تھے۔

بی اے کے بعد فلسفہ میں ایم۔اے کرنا چاہا مگر اس کی تعلیم کا انتظام لکھنو میں نہ تھا لٰہذا اعلی گڈھ پہنچے۔وہاں جی نہ لگا اور کورس کی پوری کتابیں دستیاب نہ ہونے کی بناء پر ایم۔اے سال اول میں ناکام رہے۔پھر ۱۹۱۳ء میں ایم۔اے کرنے کے لیے سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں داخلہ لیا۔لیکن نومبر ۱۹۱۲ء میں والد بزرگوار کے حج کرنے کے بعد دفعتا

انتقال کے بسبب سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے لکھنو واپس آ گے۔

مطالعہ اور کتب بینی:

مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ گھر کی کتابوں کے علاوہ اسکول کی لائبریریوں سے بھی خوب استفادہ کیا۔ بارہ سال کی عمر مراسلے اور مضمون بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ایک استاد کا کہنا ہے "میں اپنے علم میں کسی دوسرے طالب علم کو نہیں دیکھا جس نے ان سے بڑھ کر لائبریری سے کام لیا ہو"۔ [1]

مطالعہ کی کثرت نے ان کے اندر کے ادیب کو بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کالج کے ابتدائی سال تھے عمر ناپختہ تھی مگر کتابوں کے شغف نے انہیں اتنی معلومات فراہم کر دی تھی کہ تصنیف و تالیف کی جانب مائل ہو گئے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کی سوانحی کتب شائع ہو رہی تھیں، ان کی نظر سے بھی گذریں انہوں نے اپنا ہیرو محمود غزنوی کو بنالیا اور ایک مفصل مقالہ لکھ ڈالا۔ اس مقالہ میں تاریخ یمنی سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غزنوی پر بخل کا الزام لغو ہے۔ یہی کام شبلی بھی انہی دنوں کر رہے تھے کہ فرزندان اسلام پر مغرب کے الزامات کی تردید تاریخی حوالوں سے دیا جائے۔ عبدالماجد کی کتاب ایک پبلیشر نے شائع کر کے ان کا نام بھی مصنفوں کی فہرست میں ڈال دیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر اہم ادیبوں سے بھی ان کے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔

اس کتاب کے بعد ان نے ایک کتاب غذائے انسانی لکھی اس کتاب میں اس نے ڈاکٹری کتب کے حوالے سے یہ دکھایا کہ انسان کی قدرتی غذا انباتات کے علاوہ گوشت بھی ہے۔ پہلے والے پبلیشر نے اس کی دوسری کتاب بھی شائع کر دی۔

---

[1] عبدالماجد دریابادی 'آپ بیتی' ص: ۳۴۷

ملازمت:

والد صاحب کے انتقال کے بعد روزگار کا مسئلہ پیش ہوا۔ بڑے بھائی صاحب کی نائب تحصیل داری کی تنخواہ خاندان کے لیے ناکافی تھی اس لیے شروع میں فلسفہ کے لکچرار کے لیے کوشش کی، ریلوے اور ڈاک خانہ میں بھی ملازمتیں تلاش کیں۔ لیکن کہیں تقرر نہ ہوسکا۔ بعد میں مضمون نویسی اور ترجمہ کے ذریعہ کچھ آمدنی ہونے لگی۔ اسی دوران انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق نے ازراہ کرم فرمائی انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا کام معقول اجرت پر دیا۔ علامہ شبلی نے بھی سیرۃ النبیؐ کے انگریزی ماخذوں کی تلاش کا کام سونپا اور اس کے لیے پچاس روپے مشاہرہ مقرر کردیا۔

۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ مولوی عبدالحق اس کے ناظم اعلیٰ تھے۔ چنانچہ عبدالماجد دریابادی سے تعلق خاطر ہونے کی بنا پر انہوں نے انہیں یہاں بحیثیت مترجم فلسفہ مدعو کیا۔ یہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو حیدرآباد پہنچ گئے۔ اسی عرصہ میں عبدالماجد کے قلم سے ''فلسفہ جذبات'' اور ''فلسفہ اجتماع'' نکل کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیں۔ اسی دور میں مکالمات برکلے اور تاریخ اخلاق یورپ کے تراجم بھی شائع ہوئے۔

۱۱ مہینے بعد لکھنو واپس ہوئے اس کے بعد پھر حیدرآباد واپس آنا گوارا نہ کیا۔ لیکن حیدرآباد سے دلی تعلق برقرار رہا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر داود اشرف کی تحقیق یہ ہے کہ مولانا عبد الماجد دریابادی نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ستمبر ۱۹۱۷ء سے جولائی ۱۹۱۸ء تک صرف گیارہ مہینے ملازمت کی اس قلیل ملازمت پر کوئی وظیفہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے ریاست حیدرآباد سے تصنیف وتالیف کے لیے علمی وظیفہ منظور کرنے کی درخواست کی اس

پر آصف جاہ سابع نے انہیں ایک سوپچیس روپئے ماہوار وظیفہ تاحیات اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ جہاں کہیں بھی ہو وہ ہر سال ایک کتاب لکھ کر سلسلہ آصفیہ سے معنون کریں۔ ۲۷ سال بعد مولانا نے اس وظیفہ میں اضافہ کی درخواست کی جس پر آصف سابع نے ایک سوپچیس سے بڑھا کر دوسو روپئے کر دی تھی۔[۱]

شادی اور اولادیں:

مولانا عبدالماجد نے حقیقی خالہ کی پوتی عفت النساء سے ۲/ جون ۱۹۱۶ء کو عقد کیا۔ محفل عقد میں شہر کے مشہور شاعر مرزا محمد ہادی عزیز نے سہرے کے طور پر ایک طویل نظم سنائی۔

دوسرا نکاح اکتوبر ۱۹۳۰ء کو ایک بیوہ خاتون سے کیا۔لیکن بن نہیں پڑا اور طلاق کی نوبت جلد ہی آ گئی۔اور آخری عمر تک پہلی بیوی کے ساتھ ہی زندگی بسر کی۔

مولانا عبدالماجد کے کئی اولادیں ہوئیں۔لیکن مشیت ایزوی سے صرف چار بیٹیاں زندہ رہیں۔یہ چاروں علی الترتیب مولانا عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید مرحوم کے چاروں صاحبزادوں، حکیم عبدالقوی (عرف آفتاب احمد) حبیب احمد ایم اے، محمد ہاشم قدوائی، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، ریڈر شعبہ سیاسیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور عبدالعلیم قدوائی ایم اے، ایل ایل بی کے عقد نکاح میں آئیں۔

مذہب اور عقیدہ:

بیسوی صدی کا ابتدائی زمانہ خالص عقل پرستی اور مادہ پرستی کا زمانہ تھا۔مغربی ممالک کی طرف سے الحاد وتشکیک کا ایک طوفانی سیلاب اُمنڈ آیا تھا۔جس کی زد سے مولانا

---

[۱] ڈاکٹر سید داؤد اشرف 'گذشتہ حیدرآباد' ص:۴۹

عبدالماجد دریابادی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یوں تو آپ کی پیدائش خالص مذہبی گھرانے میں ہوئی، ایک زاہدانہ اور عابدانہ ماحول وراثت میں ملا اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی دینی ماحول میں ہوئی۔ لیکن کیننگ کالج کے زمانہ طالب علمی کے دوران انہوں نے مذہب بیزاروں اور ملحدوں کی تصنیفات پڑھیں اس کے نتیجے میں افکار اور عقائد کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ مزید برآں بے قید مطالعے کے ذوق وشوق نے تشکیک والحاد کی تخم ریزی کی۔ جس کے سبب ۱۹۰۹ء سے 1918ء تک ان پر مذہب بیزاری اور الحاد کا غلبہ رہا۔

ایک دن عبدالماجد دریابادی لکھنؤ کی ورما لائبریری میں بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے ان کی نگاہ ایک موٹی جلد کی کتاب پر پڑی۔ کتاب ہاتھ میں لی تو سنہری حروف ان کے منتظر تھے۔ Element of Social Science کتاب کا نام تھا اور مصنف کا نام تھا ڈاکٹر ڈریسیڈیل۔ یہ ایک نیا موضوع تھا، جواب تک ان کی نظر سے نہیں گذرا تھا، وہ کتاب پڑھنے بیٹھ گئے۔ وہ کتاب جیسے جیسے آگے جارہی تھی ان کے اندر کی کیفیات بدلتی جارہی تھیں۔ ایک ہلچل سی تھی جو بیدار ہورہی تھی۔ یہ مذہبی عقائد کی رد میں لکھی کتاب تھی۔ الحاد کی دنیا میں ایک مقام رکھتی تھی۔ کتاب کا اصل ہدف اخلاقی بندشیں تھیں، جنہیں مذہب اب تک علوم متعارفہ کے طور پر پکڑے ہوئے تھا اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے تھا۔ مثلاً عفت و عصمت، کتاب کا اصل حملہ اسی بنیادی اخلاقی عقائد پر تھا۔

کتاب کے مطابق یہ ''جنسی خواہش''، تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے، اسے مٹاتے رہنا اور اس کے لیے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا ایک فعل عبث ہے، بلکہ صحت اور جنسی قوتوں کی بالیدگی کے لیے سخت مضر ہے۔ اس لیے ایسی پابندیوں کو توڑ ڈالو اور مذہب واخلاق کے گڑھے ہوئے ضابطہ زندگی کو اپنے پیروں سے روند ڈالو۔ (ایسے ہی کئی دوسرے عقائد کی رد میں پوری کتاب لکھی گئی تھی۔)

کوئی پختہ کار مرد ہوتا تو وہ ان باتوں کو محض باتیں سمجھ کر نظر انداز کر دیتا، مگر وہ تو سولہ سال کا نوجوان طفل نادان تھا اس سیلاب کی تاب نہ لا سکا۔ ایمان و اخلاق کی کشتی یہاں ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ اب تک جن چیزوں کو جزو ایمان سمجھتا تھا، عقل وتنقید کی کسوٹی پر کمزور اور بے حیثیت نکلیں۔

اس کتاب میں ایمان پر براہ راست حملہ نہیں کیا گیا تھا مگر ان چیزوں کو کمزور بنا دیا گیا تھا کہ جو ایمان کو قائم رکھتی ہیں۔ پروپیگنڈے کا کمال ہی یہی ہے کہ براہ راست حملہ نہ ہو بلکہ اطراف وجوانب سے گولہ باری کر کے قلعے کی حالت مخدوش کر دی جائے۔ وہ بھی اس کتاب کو پڑھ کر پوری طرح گرا نہیں تھا مگر سنبھل بھی نہ سکا تھا۔

الحاد سے اسلام کی طرف مراجعت کے سلسلہ میں مولانا محمد اسلم صاحب اپنی ''کتاب بڑوں کا بچپن'' میں بڑے خوبصورت انداز میں لکھتے ہیں۔

> ''یہ جنون انہیں مغربی پاگل خانوں تک لے گیا، ہیوم اور اسپنر کی کتابیں دیکھیں، برطانیہ کے چارلس بریڈلا، جرمنی کے بوشنر، امریکہ کے انگرسول نے ذہن ودماغ میں تشکیک والحاد کے کانٹے بودیئے۔ مل کی ضخیم اور دقیق سسٹم آف لاجک نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ڈاکٹر ماڈسلی کی'' عضویات دماغی Mental Physiology اور مرضیات دماغی Mental Pathology نے ایمان کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ مغربی مصنفین اور اونچی ڈگریوں اور اسنادات کے حامل مدبرین فن کی تحقیقات عالیہ سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور لکھتے ہوئے شرمانے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان کا جب وقت آیا تو امتحانی فارم کے خانے مذہب میں بجائے مسلم کے صرف

''ریشنلسٹ'' درج کیا''[۱]

مولانا عبدالماجد کے والد نے دورانِ حج اپنے لختِ جگر کی ہدایت و بازیابی کے لیے گڑگڑا کر دعا کی تھی اور الحاد کے باوجود مولانا ماجد خود جذباتی حیثیت سے ایک حد تک اسلام کے دائرہ میں داخل تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مسیحی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں مشہور دشمن اسلام پادری زویمر Zuemer کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا۔ بہر حال والد کی دعائیں اور فطری جذبات رنگ لائے۔

> ''یکا یک دس برس کے ارتداد و الحاد کے مد میں جزر کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ یورپ کے شوپنہائے چین کے حکیم کنفوشس، بنارس کے فلسفی و درویش ڈاکٹر بھگوان داس اور کرشن جی کی بھگوت گیتا کے مطالعہ سے دل اس عقیدہ پر آ گیا کہ مادیت کے علاوہ اور اس سے کہیں ماوراء اور مافوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبیؐ نے زخمی دل پر مرہم رکھا۔ نامور ظریف شاعر اکبر الہ آبادی نے اپنے میٹھے انداز میں دل کو متاثر کیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کے سوز اور درد نے خاموش مضراب پر چوٹیں لگائیں۔ مثنوی مولانا روم رحمہ اللہ نے تو کایا ہی پلٹ دی اور شکوک و شبہات کافور کر دیے۔ مکتوبات مجدد احمد سرہندیؒ نے منزل کا تعین کر دیا۔ پہلی بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ سے کی لیکن بالآخر عقیدت و محبت حکیم الامت کی چوکھٹ پر نثار کر دی۔'' [۲]

اس ''دوبارہ'' مشرف با اسلام ہونے کا ان پر جو ردِ عمل ہوا وہ آخری عمر تک برقرار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آخری عمر تک وہ اپنے اس عمل پر پشیماں و نادم رہے اور اسلام کی خدمت و

---

[۱] مولانا محمد اسلم صاحب 'بڑوں کا بچپن' ص: ۲۴۹

[۲] مولانا محمد اسلم صاحب 'بڑوں کا بچپن' ص: ۲۵۰

ملت کی ہمدردی میں سارا زور صرف کر کے سچی دینداری کا ثبوت دیا۔ جب بھی اُس دور الحاد کا تذکرہ کرتے، بڑے افسوس کے ساتھ کرتے۔ اور مدت العمر اسے دور جاہلیت قرار دے کر اس کا ماتم کرتے۔ اُن کی خودنوشت سوانح عمری ''آپ بیتی'' کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں۔

مضمون نویسی اور صحافت:

انیسوی صدی میں مغربی افکار کی یلغار کے سبب روحانیت کی بنیادیں ہل کر رہ گئی تھی۔ مغربی مادہ پرستی کے طوفان نے ہندوستان کو اپنے نرغے میں لینا چاہا۔ اسلام پر ہر طرف سے اعتراضات کی بارش ہونے لگی۔ ایسی حالت میں حق گو اور بے باک نفوس خاموش کہاں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف مولانا محمد علی جوہر ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' میں پُر زور الفاظ سے قوم کو بیدار کر رہے تھے تو دوسری طرف مولانا آزاد ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں بے مثال خطیبانہ انداز میں انقلاب کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ مولانا عبدالماجد کی مضمون نگاری کا آغاز بھی اسلام کی مدافعت سے ہوا۔

اسکول کے زمانے ہی سے اخباروں اور رسالوں سے خاص دلچسپی تھی۔ پیسہ اخبار (ہفتہ وار) اودھ اخبار (روزنامہ) ریاض الاخبار (سہ روزہ) اودھ پنچ (لکھنؤ) ماہنامہ معارف (علی گڑھ) ماہنامہ دلگداز (لکھنؤ) علی گڑھ میگزین اور انگریزی کے ایڈوکیٹ (لکھنؤ) پنجاب آبزرو (لاہور) اور پانیر (الہ آباد) میں سے بعض گھر پر آتے تھے۔ اور بعض کی شکلیں دیکھ چکے تھے۔ اُس زمانہ میں بعض رسائل اسلام کی ترمیم وتضحیک میں چھپنے لگے تھے۔ مذہبی دنیا میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، لیکن جواب لکھنے کی ہمت کم ہی لوگوں کو ہوتی تھی۔ عبدالماجد دریابادی ابھی صرف بارہ برس کے تھے کہ لکھنؤ کے مشہور روزنامہ ''اودھ اخبار'' میں فرضی نام سے اپنا پہلا مضمون ارسال کیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اودھ اخبار کے

علاوہ ریاض الاخبار میں بھی مضامین ارسال کرنے لگے۔ اب وہ مضمون نگاری کے ابتدائی منزلوں سے نکل چکے تھے۔ چنانچہ وہ متذکرہ بالا دو اخباروں کے علاوہ دوسرے اخبار و رسائل میں بھی کبھی اپنے اور کبھی فرضی نام سے لکھنے لگے۔ ماہ نامہ ''الناظر'' میں ۱۹۱۰ء مولانا شبلی کی ''الکلام'' پر تنقیدی نظر کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ جس کا چرچہ مدتوں قائم رہا۔ پھر اس کے بعد ''الناظر'' سے تو جیسے مستقل تعلق ہو گیا۔ اس طرح عبدالماجد مولانا شبلیؒ کے ماہ نامہ ''الندوہ'' سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''الندوہ نے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا کہ دیگر سارے رسالے جریدے نظر سے گر گئے اور دل و جان سے شبلی کا کلمہ پڑھنے لگے، مولانا شبلی کا علم و فضل، اسلوب و طرز بیان سب دماغ پر چھا گئے اور کہنا چاہیے کہ علمی و قلمی زندگی کا ایک نیا دور اسی وقت شروع ہو گیا۔''[۱]

جیسے جیسے ان کے قلم میں توانائی آ گئی، صحافت سے ان کا شغف بھی بڑھتا گیا۔ چنانچہ مختلف رسائل و اخبارات میں اپنے مضامین اور مراسلے شائع کرتے رہے۔ یہ مضامین کبھی علمی اور سیاسی ہوتے، کبھی ادبی، کبھی مذہبی، کبھی ایڈیٹوریل نوٹ لکھتے اور کبھی تنقید اور تبصرے۔ جن اخبارات اور جرائد میں کسی نہ کسی مبحث پر ان کے مراسلے، نوٹ، تبصرے اور مضامین نکلتے رہے ان کے نام یہ ہیں۔ اودھ اخبار، ضیاء الاسلام، وکیل، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، الناظر، الندوہ، العصر، ادیب، صبح امید، معارف، ہمدم، ہمدرد، حقیقت، ایڈوکیٹ، (لکھنؤ) نیچر (لندن) سیٹر ڈے ریویو (لندن) انڈین ریویو (مدراس) وغیرہ

۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار ''سچ''، اور بعد میں ''صدق'' و ''صدق جدید'' کے تو وہ باقاعدہ ایڈیٹر تھے۔ بلکہ ایک طویل مدت تک تقریباً سارے صفحات صرف ان ہی کے قلم کے

[۱] عبدالماجد دریابادی 'آپ بیتی' ص:۲۰۶

رہین منت تھے۔اس سلسلہ کے دوسری تمام تفصیلات کو مقالے کے دوسرے باب میں شامل کیا گیا ہے۔

تصنیفی کارنامے:

۱۹۰۹ء میں انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں دو مقالے ''محمود غزنوی'' اور ''غذائے انسانی'' وکیل (امرت سر) کے لیے لکھے تھے۔جو وکیل ٹریڈنگ ایجنسی نے ۱۹۱۰ء میں کتابی شکل میں شائع کئے۔۱۹۱۷ء میں سائیکالوجی آف لیڈرشپ نامی کتاب انگریزی میں لکھی جو لندن سے شائع ہوئی۔اولاً انہوں نے ایک ایسے فلسفی مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کی جس نے فلسفہ جدید خصوصاً اس کی شاخ نفسیات کے مضامین کو اردو میں انتہائی انشاء پردازانہ رنگ میں منتقل کیا۔اس سلسلہ میں ''فلسفہ جذبات،''''فلسفہ اجتماع'' ''مکالمات برکلے'' اور ''ہم آپ''، بہت مقبول ہوئے۔اس کے علاوہ قرآنیات، حدیث، تصوف، سوانح، آپ بیتی، فلسفہ ونفسیات، سفرنامے، متفرق عنوانوں پر مشتمل چھوٹی بڑی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔جو ان کے مجتہدانہ انداز، مسحور کن اسلوب نگارش اور دلآویز منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ قوم وملک کی مکمل ترجمان ہیں۔علاوہ ازیں ان کی کتابوں میں جو بہت زیادہ مشہور ہوئی وہ سفرِ حجاز، ذکر رسولؐ، حکیم الامت نقوش وتاثرات، محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، تصوف اسلام، انشائے ماجد، آپ بیتی مناجات مقبول وغیرہ ہیں۔

کسب علم وادب کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ''پڑھنا لکھنا جو کچھ آیا، اس میں بڑا دخل مولوی شبلی کو ہے۔ان سے بہت کچھ سیکھا، گویا اولین استاد وہی تھے۔بعد کو زبان کی حد تک بڑی مدد مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی سے اور کسی حد تک شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلی سے ملی۔باقی تھوڑی بہت خوشہ چینی خدا معلوم کتنے

خرمنوں سے کی اوراب بھی کررہا ہوں۔سب کے نام کہاں تک گنا سکتا
ہوں۔اللہ ان سب کو جزائے خیرعطا کرے۔[۱]

فریضۂ حج کی ادائیگی:

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۲۹ء میں ۳۷ سال کی عمر میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔اپنی اہلیہ اورعزیزوں کے علاوہ ان کے ہمراہ مولانا مناظر احسن گیلانی بھی ساتھ تھے۔حج وزیارت سے فراغت کے بعد ایک مفید کتاب ''سفرِ حجاز'' کے نام سے تحریر کی۔یہ سفرنامہ ادب وانشاء کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور جذبات عقیدت کے لحاظ سے بھی۔

شعری ذوق:

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک صاحب طرز ادیب، اپنے دور کے انشاء پرداز، مفسر قرآن اورنامور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔نوجوانی میں ان کی طبیعت شعروشاعری کی طرف مائل ہوئی تھی، خودفرماتے ہیں ''۱۹۱۱ء سے میرا دورِ غزل گوئی شروع ہوا جو شادی سے دوسال قبل شروع ہوا اور شادی کے ڈیڑھ دوسال بعد تک رہا'' یہ عبادت اس بات کی غمازی کررہی ہے کہ کسی کے تیرِ نظر نے انہیں شاعر بنادیا۔کیونکہ آگے لکھتے ہیں کہ ''جہاں میں چاہتا تھا وہیں میری شادی ہوئی''۔

''الناظر'' اورمعارف اعظم گڑھ کی ۱۹۱۷ء کی اشاعتوں میں ان کی غزلیں شائع ہوئی تھیں۔عبدالماجد دریابادی نے شاعری میں ''ناظر'' تخلص اختیار کیا۔اصلاح کے لیے کبھی کبھی اپنی غزلیات اکبرالہ آبادی کے پاس بھیجتے رہے۔غزلیں عموماً حسرت موہانی، شیفتہ اور جوہر کی زمینوں میں ہوتی تھیں۔زود پشیماں (ڈرامہ) اسی دور کی دین ہے۔اس میں

[۱] ماہنامہ فروغ اردو ''عبدالماجد نمبر'' صفحہ ۲۲، ۲۳

شامل غزلیں انہیں کی کہی ہوئی ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا کو شعر وسخن سے بے حد دلچسپی تھی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھپے شاعر اور کھلے انشا پرداز تھے۔ انہوں نے غزلیوں کے علاوہ نعتیں بھی کہی ہیں، جو زبان و بیان کے اعتبار سے عمدہ ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام ''تغزل ماجدی'' سے غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم شہیدان وفا موت کے خود ہیں مشتاق
کفر اس شرع میں ہے طالب درماں ہونا
لذتِ درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر
ناظرؔ آساں نہیں غالبؔ سا سخنداں ہونا

OOO

چند مطلع اور مقطعے پیش ہیں:

رفتارِ فلک دیکھ زمانے کی ہوا دیکھ
اے کورِ بصر دہر کا انجام ذرا دیکھ
خودداری تقویٰ پہ ہے کیوں ناز یہ زاہد
ناظرؔ کو درِ بُت پر کبھی ناصیہ دیکھ

OOO

آہ مِنّت کشِ اثر نہ ہوئی
شبِ غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
ہم گرایانِ عشق کو ناظرؔ
فکر الطافِ اہلِ زر نہ ہوئی

OOO

لب تک جو شکوے آپ کے آ آ کے رہ گئے
دب دب کے ولولے دلِ شیدا کے رہ گئے
کیا طے کریں گے وادئ اُلفت کی منزلیں
ناظر جو ابتداء ہی میں گھبرا کے رہ گئے

OOO

لو دیکھو آگیا ہے زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبط محبت کیے ہوئے

OOO

ہو چکی صبر و سکون و خاموشی کی انتہا
جامِ ضبطِ آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے

OOO

ان کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

وعدے ہیں شفاعت کے تسکین کی ہیں باتیں آقائے دو عالم کی دیکھو تو مدارتیں
غم خواری امت سے اک آن نہیں غافل ظاہر میں تو ہے پردہ، پردے میں ملاقاتیں
محشر میں اماں پائی صدقے میں درودوں کے
دشواری میں کام آئیں بھیجی ہوئی سوغاتیں

OOO

پڑھتا ہوا محشر میں جب صَلِّ علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اُٹھی اور ابرِ کرم چھایا
جب وقت پڑا نازک، اپنے ہوئے بیگانے
ہاں کام اگر آیا تو نام ترا آیا

مبارک رہے شیخ کو طوافِ کعبہ
جبیں میری ہے اور اُن کی گلی ہے

OOO

آہ اِک شب تو بااثر ہوتی

وہ تجلّئ حق ادھر ہوتی
ہے حضوری نصیب میں شاید
ہند میں اب بسر نہیں ہوتی

OOO

مولانا عبدالماجد تقریباً نصف صدی تک کشت علم وادب کو سینچتے رہے۔انہوں نے اپنے ادبی وعلمی کارناموں سے دامن اردو کو مختلف جواہر علم وادب سے مالا مال کیا۔ان کی تصنیفات وتالیفات اور تراجم کی مکمل فہرست پیش ہے۔

موضوعاتی فہرست تصانیف:

اسلامیات وقرآنیات

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	تفسیر ماجدی، کامل ایک جلد	تاج کمپنی، لاہور کراچی
۲۔	تفسیر ماجدی اضافہ وترمیم شدہ ۳ جلدی	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ
۳۔	اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں	صدق جدید ایجنسی
۴۔	ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی	صدق جدید ایجنسی
۵	الحیوانات فی القرآن	مکتبہ ندوہ المعارف، بنارس

۶۔	بشریت انبیاء	مکتبہ اسلام، لکھنؤ
۷۔	قصص ومسائل	اسلامک پبلشرز، لکھنؤ
۸	مشکلات القرآن یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں	اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، مدراس
۹۔	تصوف اسلام	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
۱۰۔	تمدن اسلام کی کہانی	تنظیم اصلاح معاشرہ، لکھنؤ
۱۱۔	ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	ادارۂ انشائے ماجدی، کلکتہ

ادب وانشاء

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	اقبالیات ماجد	قبال اکیڈمی، حیدرآباد (اے پی)
۲۔	مضامین عبدالماجد (مرتب: غلام دستگر رشید)	ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد (اے پی)
۳۔	مقالات ماجد	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور
۴۔	زور پشیماں (ڈرامہ)	الناظر بک ایجنسی لکھنؤ
۵	ذکر وفکر اکبرالہ آبادی	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ
۶۔	مثنوی بحرالمحبت	دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۷۔	تغزل ماجدی شعری مجموعہ	مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی، لکھنؤ مرتب: عبدالقوی دریابادی

فلسفہ ونفسیات

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	فلسفہ ونفسیات	
۲۔	فلسفہ جذبات	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی
۳۔	فلسفہ اجتماع (مولانا نے اس کو اپنی فہرست سے خارج کردیا)	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی

۴۔	غذائے انسانی	وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی، امرتسر
۵	فلسفیانہ مضامین	الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ
۶۔	فلسفہ کی تعلیم گزشتہ اور موجودہ	الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ
۷۔	مبادیٔ فلسفہ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۸	ہم آپ (پاپولر سائیکالوجی)	ہندوسیانی اکیڈمی، الہ آباد
۹۔	فرائض والدین	نول کشور بکڈ پو، لکھنو

آپ بیتی، سوانح

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	آپ بیتی	مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ
۲۔	وفیاتِ ماجدی (مرتب: حکیم عبدالقوی دریابادی)	ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ
۳۔	معاصرین	ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ
۴۔	محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق (۲ جلدیں)	دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۵	حکیم الأمت (نقوش وتاثرات)	سعدی بک ڈپو، آلہ آباد
۶۔	محمود غزنوی	وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی، امرتسر
۷۔	چند سوانحی تحریریں	مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی، لکھنؤ

سفرنامہ

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	سفرِ حجاز	ادارہ انشائے ماجدی، لکھنؤ
۲۔	تاثراتِ دکن	بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی
۳۔	ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ
۴۔	سیاحت ماجدی، مرتب حکیم عبدالقوی دریابادی	ادارے انشائے ماجدی، کلکتہ

تراجم وتالیفات

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	تاریخ تمدن (جلد دوم)	علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کالج، علی گڑھ
۲۔	پیامِ امن	دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۳۔	تاریخِ یورپ	دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد
۴۔	تاریخ اخلاق یورپ (۲ جلدیں)	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی
۵	مکالمات برکلے	دارالمصنفین، اعظم گڑھ
۶۔	منطق	دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۷۔	ناموران سائنس	میکملن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ، کلکتہ
۸۔	مناجاتِ مقبول	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ
۹۔	شوق آخرت	ادارہ اسلامیات، لاہور

خطبات وتقاریر

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	سیرتِ نبوی قرآنی یا خطبات ماجدی	صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ
۲۔	خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ	آل انڈیا خلافت کانفرنس، لکھنؤ
۳۔	تمدن اسلام کا پیام بیسوی صدی کے نام	ادارہ ادبیات، دہلی
۴۔	نشریاتِ ماجد (ریڈیائی تقریریں) مرتب: عبدالعلیم	خاتون منزل حیدر مرزا ازدو، لکھنو

مرتبات ومکتوبات

نمبر شمار	نام کتاب	شائع کردہ
۱۔	سچی باتیں، مرتب :حکیم محی الدین ہلال	دکن پبلیشرز اینڈ پرنٹرلمیٹیڈ حیدرآباد
۲۔	سچی باتیں، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی	خاتون منزل حیدر مرزا روڈ لکھنؤ
۳۔	فیہ مافیہ	دارالمصنفین ،اعظم گڑھ
۴۔	تحفہ خسروی	اودھ بک ایجنسی دریاباد، بارہ بنکی
۵	خطوطِ مشاہیر (جلداول)	نسیم بکڈ پو، لکھنؤ
۶۔	مکتوباتِ سلیمانی (دوجلدیں)	دارالمصنفین ،اعظم گڑھ
۷۔	مکاتیبِ اکبر	دارالمصنفین ،اعظم گڑھ
۸۔	مکتوباتِ ماجدی (۳جلدیں)۶	مرتب: ہاشم قدوائی
۹۔	چہل حدیث ولی اللہی ،مرتب: نعیم الرحمن صدیقی	خاتون منزل حیدر مرزا روڈ لکھنؤ
۱۰۔	نورانی جہیز، مرتب: مولوی محی الدین منیری	صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ

English Books

1.	Quran Hakeem Translation & Explanation	Taj Company Lahore
2.	Holy Quran With English Translation	Taj Company Lahore
3.	Tafseerul Quran	Academy of Islamic
4.	The Glorios Quran Text, Translation & Commentary liecester(U.K)	The islamic Foundation
5.	The Psychology of leadership	T.Fisher Unwin London(U.K.)

اعزازات:

۱۔ ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی (برطانیہ) ممبر ارسٹوٹیلین سوسائٹی (برطانیہ)
۲۔ ۱۹۲۵ء میں اعزازی ''ندوی'' کا خطاب از طرف انجمن طلبہ قدیم دار العلوم ندوۃ العلماء
۳۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔
۴۔ ۱۹۶۶ء میں یوپی کی حکومت نے قابل قدر تصانیف کی بنا پر نقد پانچ ہزار روپے کا انعام دیا
۵۔ اگست ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے عربی کا صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا۔
۶۔ ۱۹۷۴ء میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی لکھنو نے ادبی اعزاز سے نوازا۔
۷۔ ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے ہاتھوں دی گئی۔

اس کے علاوہ مولانا دریابادی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو، دار المصنفین اعظم گڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، اترپردیش اردو اکیڈیمی لکھنؤ جیسے اداروں سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔

صحت جسمانی:

عبدالماجد دریابادی کی صحت ہمیشہ سے ہی نازک ہی تھی 11 یا 12 سال کی عمر میں ان پر ملیریا کا حملہ ہوا تھا عام سی بیماری تھی مگر ٹھیک ہوگئی مگر اگلے ہی سال پھر حملہ ہوا تو تشویش ہوئی یہاں تک کہ 18 سے 19 سال تک سالانہ حملوں کے شکار ہوتے رہے۔ پھر نزلہ وزکام کے بھی دائمی مرض میں مبتلا تھے۔ جب حیدرآباد میں قیام پزیر تھے تب اپنڈکس کا بھی شکار ہوئے۔ ایک حاذق حکیم سے ملاقات ہوئی تو بنا آپریشن تکلیف سے نجات ملی۔ ان ملیریا کے سالانہ حملوں اور مسلسل نزلے کے باعث بینائی متاثر ہوئی۔ نوجوانی میں کچھ خیال نہ کیا، لیٹ کر اور کم روشنی میں پڑھا کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ 37 سال کی عمر میں رات کا مطالعہ

چھوڑ دینا پڑا۔40سال کی عمر میں صحت انتہائی خراب ہو چکی تھی۔مرض قلب میں مبتلا تھے۔ علاج جاری تھا پرافاقہ نہ آ رہا تھا کسی کے مشورے پر صبح کی سیر کو معمول بنالیا تھااس ہواخوری سے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔اور صحت سنبھلنے لگی۔مگر پھر بھی جب بھی سردیاں آتیں بیمار ضرور پڑتے اور ہفتوں مبتلارہتے ،مگر جوں جوں بڑھاپا آتا جارہا تھا قوت مدافعت جواب دیتی ہی جارہی تھی بیماری ہفتوں سے مہینوں پر پھیلنا شروع ہوگئی۔اس پر سے یہ احساس کے عمر کم رہ گئی ہے مزید کام شروع کردیا کہ جوکرنا ہے جلد کرلونجانے کب رخصت ہوجانا پڑے۔80سال پار کرنے کے بعد قوت ارادی بھی جواب دے گئی۔یہاں تک کہ اخبار میں چاہنے والوں نے خبر بھی لگا ڈالی کہ مولانا دریابادی نے صحافتی قلم رکھ دیا۔پر کسے معلوم تھا کہ تیاری کسی اور طرف کی ہو رہی ہے۔

وفات:

14 جنوری 1974ء کو مغرب کی نماز کے بعد فالج کا حملہ ہوگیا،اثر دائیں جانب ہوا ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ڈاکٹری علاج کے بعد لکھنو میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے پاس ہومیوپیتھی کا شروع ہوا،تو مرض جہاں تھا وہیں رک گیا۔افاقہ ملتے ہی ایک مختصر سانوٹ لکھ اخبار میں بھیج دیا کہ پڑھنے والوں کو ان کے بارے میں آگاہی ہو سکے۔لاکھوں صفحات لکھنے والے کو یہ چھوٹا رقعہ بھی لکھنے کے لیے ایسا لگا کہ گویا ایک پہاڑ سا کاٹ رہے ہوں۔اخبارات میں بار باران کی صحت کی خبریں دیکھ کر حکومت کو بھی ہوش آ گیا،ریاستی گورنر خود عیادت کو آئے۔پھر تو حکومتی عہدیداران کا تانتا بندھ سا گیا۔صحت تو سنبھل گئی تھی پر حافظہ جاتا رہا تھا۔کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ان کا لکھا ہوا پڑھنا دشوار ہوجاتا تھا۔بولنے میں لکنت آ گئی تھی کہ سمجھنا دشوار تھا۔بصارت انتہائی کمزور ہوگئی تھی۔اسی میں ۱۹۷۴ء گزرا اور ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء بھی،قیام کبھی دریاباد میں رہتا اور کبھی لکھنؤ میں۔

جن دنوں قیام لکھنؤ میں تھا مسلم یونیورسٹی کے کانووکیشن کے لیے انہیں علی گیڈھ بلوایا گیا۔ صحت آنے جانے کے قابل نہ تھی پر احباب کے مجبور کرنے پر اپنے بھتیجے کے ساتھ یونیورسٹی پہنچے جہاں انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر پر اعزازی ڈگری دی گئی۔

رمضان آئے تو دریاباد چلے آئے۔ پورا رمضان تراویح میں انتہائی ضعف کے باوجود قرآن مکمل سنا۔ اکتوبر کی ایک رات آ گئی۔ کسی کام سے بستر سے اٹھے تو ٹھوکر لگ گئی پوری رات تکلیف میں گزار دی۔ صبح ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو علم ہوا کہ کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ہڈی جوڑ پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ ایک چوبی تخت تھا جس پر لیٹے رہا کرتے تھے، داہنی کروٹ پر لیٹ نہ سکتے تھے پلاسٹر جو چڑھا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا کہ آنکھیں اب اس قابل ہی نہ تھیں۔ سب کو یقین آ گیا تھا کہ اب عبدالماجد کا وقت رخصت قریب ہے، خود عبدالماجد بھی ہر ایک سے اپنی مغفرت کے لیے دعا کرنے کے لیے کہتے تھے۔ لڑکیوں کو اپنے پاس بلا لیا تھا کہ جب تک جیتے ہیں انہیں دیکھتے رہیں۔ ایک دن لڑکیوں کو پاس بلا کر اپنی کتابوں کی تقسیم بھی کروا دی کہ انگریزی کی کتابیں ندوہ کے دارالمطالعے کو اور اردو، عربی اور فارسی کی کتب مسلم یونیورسٹی کو دے دی ہیں۔ یہ جملہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ منجھلی بیٹی نے عرض کیا کہ ہمیں علم ہے کس طرح آپ نے انہیں جمع کیا ہے اور اب تقسیم کر رہے ہیں!؟ کتابیں ہمارے پاس اپنی نشانی کے طور پر ہی رہنے دیں۔ جواب میں عبدالماجد نے کہا اچھا یاد دلایا ایسے ہی جمع نہیں ہو گئیں تھیں کتابیں، ناشتے میں انڈہ بہت پسند تھا لیکن میں نے ابلے آلو انڈے سمجھ کے کھانا شروع کر دئے پیسے جوڑے اور کتابیں خریدیں، کتابوں میں حالی ہیں، شبلی بھی ہیں دل ان سے جدائی کا نہیں چاہتا، لیکن تم لوگ اپنے گھروں کی ہو۔ کل چلے جاؤ گی، کتب خانے کی حفاظت کون کرے گا؟ بیٹا ہوتا تو اور بات تھی۔

پہلی بار اپنی اولاد نرینہ کی کمی کا بہت احساس ہوا اور اس کا اظہار بھی کیا، یقیناوہ 2 بیٹے ضرور یاد آئے ہوں گے جو عالم شیر خوارگی ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ان کی 4 بیٹیاں تھیں (رافت النسا، حمیرا کاتون، زہیرا خاتون اور زاہدہ خاتون) آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب علی گڑھ سے ٹرک کتابیں لینے ان کے دروازے پر کھڑا تھا اور وہ بے بسی سے اسے لادتے دیکھ رہے تھے۔ بیٹی سے اظہار کیا کہ ایسا لگ رہا ہے ایک اور بیٹی کو رخصت کر رہا ہوں۔ان دنوں قیام لکھنؤ میں خاتون منزل پر تھا۔دسمبر کا مہینے کا آخری تھا کہ فالج کا نیا حملہ ہو گیا۔احباب ملنے آتے رہے سرہانے بیٹھتے اور چلے جاتے ،عبدالماجد کچھ بھی بولنے سے قاصر تھے، آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے،حواس قائم نہ رہے تھے، بار بار غفلت طاری ہو جاتی تھی لیکن اس عالم میں بھی بار بار ہاتھ کان تک اٹھاتے اور اس کے بعد نیچے لاکر نماز کے انداز میں باندھ لیتے تھے۔

ایک روز اپنی منجھلی بیٹی کو بلا کر کہنے لگے کہ

وہ جو آتا ہے ف۔۔۔

بیٹی نے جملہ مکمل کیا کہ فرشتہ؟

بولے۔ہاں اور داہنی جانب اشارہ کیا اور کہا آ گیا ہے۔

۶ رجنوری ۱۹۷۷ء بروز جمعرات شب دو بجے طبیعت بہت خراب ہوگئی اور دو گھنٹے بعد ساڑھے چار بجے قبل فجر، اپنے لکھنوی مکان خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، لکھنؤ میں وفات پائی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

جنازہ کی پہلی نماز دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہت بڑے مجمع کی موجودگی میں مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے ان کی حسب وصیت پڑھائی۔دوسری نماز دریاباد

میں حافظ غلام نبی نے پڑھائی۔ تدفین مولانا کے مکان واقع محلہ مخدوم زادگان دریاباد کی پشت پر درگاہ حضرت مخدوم آبکشؒ میں ہوئی۔

آپ کی تاریخ وفات بہت سے شعراء نے نکالی ہے۔ ایک قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔

ان کا مشکل سے ملے گا اب زمانے میں بدل
نامور عالم کی ہے تاریخ رحلت برمحل
عبدالماجد آہ! تھے جو پیکر علم و عمل
موت العالم موت العالم سچ ہے یہ ضرب المثل
۱۳۸۷ھ

(بشیر صدیقی انبالوی)

الغرض مولانا عبدالماجد دریابادی بیسویں صدی کے ایک ایسے مخلص رہنما، مایہ ناز صاحبِ طرز ادیب، دانشور، مفسّر قرآن، صحافی اور مصنف و مترجم گزرے ہیں جن کے ہم عصروں اور بزرگوں نے ان کے علم و فضل کی ہمیشہ قدر کی۔ وہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی اتنے ہی ماہر تھے۔ ان کی شخصیت و عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے عظیم المرتبت ادیب، مورخ، فلسفی و شاعر علامہ شبلی نعمانی ہوں یا علامہ سید سلیمان ندوی، مشہور مفسّر ادیب و سیاستدان مولانا ابوالکلام آزاد ہوں یا مشہور شاعر، بلند پایہ ادیب، حضرت اکبرالہ آبادی ہوں یا مولانا محمد علی جوہر و مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، یہ سب حضرات مولانا عبدالماجد دریابادی کی قابلیت لیاقت اور ان کے علم کی پختگی کے معترف تھے اور مختلف مواقع پر ان سے مضامین لکھواتے، تراجم کرواتے اور دیگر امور میں ان سے مشورے لیتے۔ علم و حکمت کا یہ ستارہ جس نے اپنی چمک دمک سے اہل علم و دانش کو منوّر کیا اور اس کی روشنی سے کئی اہل علم نے فیض اُٹھایا۔

حصہ ''ب'' شخصیت

انسان کے چہرے بشرے اور حرکات وسکنات سے اس کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی عادات واطوار اس کی پسند ناپسند، اس کے پیمانے، معیارات وترجیحات اور اس کے روزمرہ کے سارے معمولات اس کے دل ودماغ کی عکاسی کرتے ہیں۔ غرض کہ ظاہر، باطن کا غماز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کا جائزہ لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

حلیہ ولباس:

مولانا عبدالماجد طالب علمی کے زمانے ہی سے ایک خوشنما، باوقار سنجیدہ شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا چہرہ بیضوی گول، رنگ کھلتا ہوا گورا، جسم مضبوط سڈول، اور قد متوسط تھا۔ وہ اعلیٰ قسم کا لباس اور سر پر کھدر کی ٹوپی پہنتے تھے۔ ایام شباب میں اچھے قسم کے ہندوستانی لباس کے علاوہ انگریزی لباس بھی زیب تن کرتے تھے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ان پر الحاد کا غلبہ تھا، لیکن جب ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور وہ مسٹر عبدالماجد سے مولانا عبدالماجد بنے تو لباس کے ساتھ رہن سہن کے طور طریقوں میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ اب وہ موٹے ڈھیلے ڈھالے لباس زیب تن فرماتے تھے۔ اکثر لمبا سوتی کرتا اور اس پر عباء اور شرعی پاجامہ پہنتے تھے۔ وہ پہلے ہلکی

مونچھیں اور داڑھی صاف رکھتے تھے، لیکن بعد میں داڑھی رکھنے لگے تو نورانی چہرے پر نورانی داڑھی نہایت خوش نما معلوم ہوتی۔

عادت واطوار:

ہر انسان کے کچھ مخصوص عادات ومعمولات ہوتے ہیں۔خود مولانا عبدالماجد اپنے تعلق سے اپنی کتاب ''آپ بیتی'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ''پڑھنے کا شوق سرشت میں داخل ہے، وظیفہ وغیرہ زبانی جب جب پڑھے کچھ ہی دیر بعد نیند آنے لگی یا طبیعت اُکتا گئی گو نیند کتاب دیکھتے دیکھتے بھی آجاتی ہے لیکن کتاب اس حال میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ذرا سی جھپک کے بعد تازہ دم ہو جاتا ہوں کتاب جب مل جائے تو پھر پروا کسی سے ملنے جلنے کی رہتی،عزیزوں غریبوں سے بھی، اب ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ جی لگنے کی باتیں تفسیر ومتعلقات قرآن ہی کی ہوسکتی ہیں۔اس کے بعد نمبر لغت واثریات کا آتا ہے اور انگریزی کتابوں میں تاریخ قدیم (مصر،عرب وغیرہ) یا پھر مختلف انسایکلو پیڈیا ئیں۔ایک زمانہ میں خاص موضوع مطالعہ سایکالوجی تھا۔اُردو میں رطب ویابس سب ہی پڑھ ڈالتا ہوں۔قرآن مجید، لغت،تاریخ اور کلام شعراء کالج چھوڑنے پر اُستاد کیمرن نے ایک سرٹیفکٹ میں یہ لکھا تھا کہ ''میں اپنے علم میں کسی دوسرے طالب علم کو نہیں دیکھا جس نے ان سے بڑھ کر لائبریری سے کام لیا ہو''۔ [۱]
>
> ''اچھے شعر سننے کی جگہ اچھے گانے کا بھی شوق رکھتا ہوں، گو ادھر سالہا سال سے سننے کا اتفاق ہی کہاں ہوا۔اور کچھ تھوڑی بہت پرکھ بھی۔

[۱] عبدالماجد دریابادی 'آپ بیتی' ص:۳۴۷

البتہ اس شوق کو دبائے ہوئے رکھتا ہوں۔ اچھی آواز کو سن کر کبھی وجد میں آجاتا ہوں، خود بھی ترنم سے شعر پڑھ لیا کرتا ہوں، خصوصاً مثنوی وغیرہ'' [۱]

طبیعت زیادہ ملنے جلنے کی خوگر نہیں، اور عقلاً و تجربۃً بھی زیادہ میل جول میں بُرائیاں ہی زیادہ نظر آتی ہیں، پھر بھی خشک مزاج نہیں ہوں، اور لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتا ہوں اور حقیر سے حقیر آدمی سے بھی ملنے اور اس کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے میں بحمد للہ کوئی عار نہیں محسوس کرتا۔ کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ بڑے اور چھوٹے ہر ملنے والے سے کوئی نہ کوئی سبق سیکھوں اور ہو سکے تو اسے بھی کچھ سکھاؤں۔

عموماً لڑکے جب ذرا بڑے ہو لیتے ہیں تو ان سے بے تکلف ہو کر اور خوب کھل کر بات چیت کرنا پسند کرتا ہوں اور ان کی آئندہ فلاح و صلاح کے لیے ہر طرح کی باتیں، ان کا بے تکلف دوست بن کر ان کے کان میں ڈالتا رہتا ہوں''۔[۲]

''زبانی بحث و مباحثہ سے بہت گھبراتا ہوں' اس کی ایک وجہ تو طبعی شرمیلا پن ہے' زبان بے دھڑک کھلتی نہیں ہے، دوسرے اپنی اشتعال پذیری سے بھی ڈرتا رہتا ہوں۔ معلوم نہیں غصہ میں کیا کچھ زبان سے نکل جائے۔[۳]

عبدالماجد دریابادی کے عادات و اطوار شریف اور پاکیزہ تھے۔ وہ ساری زندگی وقت کی پابندی کرتے رہے۔ ہر کام کا وقت مقررہ پر انجام دینا اُن کی فطرت ثانیہ تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو معمول کا اتنا پابند بنا لیا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا احترام اور نازک رشتوں کا خیال بھی انہیں اس معمول کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے

[۱] عبدالماجد دریابادی 'آپ بیتی' ص:۳۴۸

[۲] ایضاً۔ ص:۳۵۱

[۳] ایضاً ص:۳۵۱

اگر کوئی ان سے ملاقات کے لیے جانا چاہتا تو پہلے سے وقت مقرر کرانا ضروری تھا۔ یہ اوقات کی پابندی کا نتیجہ ہے کہ ان کے قلم سے گرانقدر علمی وادبی سرمایہ اہل علم کو نصیب ہوا۔ ڈاکٹر عتیق الرحمن رقمطراز ہیں۔

> ''اصول وضوابط کی پابندی کی مثال یا تو حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یا پھر مولانا موصوف کے یہاں۔ ہر بات کا اصول متعین۔ ہر ہر کام کا اوقات بندھے ٹکے۔ آپ کے تعلقات بے حد وسیع اور گوناگوں تھے۔ بڑوں سے بھی اور چھوٹوں سے بھی۔ عقیدت کی بھی اور سیاسی بھی۔ خالص ادبی اور ٹھیٹ دینی اور مذہبی بھی آپ ان سے نباہ کی پوری رعایت اور خیال واہتمام سے کام لیتے تھے۔ کیا مجال جو کہیں ضابطہ اور اصول میں فرق آجائے مشاغل درہم برہم ہوجائیں'' [1]

اس قدر اصول اور ضابطہ کی پابندی بہت کم لوگوں کی زندگی میں دیکھنے میں آتی ہے۔ حتی کہ سفر وحضر میں بھی ان اوقات واصولوں کا خیال رکھتے تھے۔ پہلے سے طئے کئے بغیر وہ کسی بڑی سے بڑی علمی، ادبی وسیاسی شخصیت سے بھی ملنے کے روادار نہیں تھے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کی کامیابی کا راز یہی تھا۔

اصول اور نظم وضبط کے اس قدر پابند ہونے کے باوجود مولانا نہایت مخلص، ہمدرد اور منکر المزاج واقع ہوئے۔ وہ اپنے پہلو میں ایک حساس اور نازک دل رکھتے تھے۔ وہ وسیع النظر اور رقیق القلب انسان تھے۔ ہر ایک کے لیے ان کے دل میں جگہ تھی۔ بڑوں سے محبت، چھوٹوں پر شفقت، اہل خاندان سے اچھے روابطہ اور دوست احباب کا پاس ولحاظ، ان کی عین فطرت تھی۔ انہوں نے اپنے محبوب معاصرین کی رحلت پر جو نثری مرثیے تحریر

[1] ڈاکٹر عتیق الرحمن خاں عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات ص: ۱۴، ۱۵

فرمائے وہ ان کے گہرے دلی تعلقات کا پتہ دیتے ہیں۔اپنی والدہ کی وفات پر''ماں کے قدموں پر'' کے عنوان سے جولکھااور اپنی اہلیہ کی وفات پر''بوڑھی محبوبہ'' کے عنوان سے جو تحریر کیا اُس کی ایک ایک سطر، اور ایک ایک لفظ نہایت جگر پاش اور دل خراچ ہے۔جو گہری محبت اور حزن وفراق کا لازمی نتیجہ ہے۔ان کے تحریر کردہ نثری مراثی سے جہاں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ اہل خاندان اور معاصرین سے شدید محبت اور گہری الفت رکھتے تھے وہیں یہ بات بھی منکشف ہوجاتی ہے کہ ان کی زندگی کسی قدر پاکیزہ اوران کے رجحانات کس قدر نیک تھے۔

مولانا مجلسی آدمی بالکل نہیں تھے۔وہ عام محفلوں اورتقریبوں میں نہایت سنجیدہ اور مرقع وقار بنے رہتے تھے۔البتہ نجی مجلسوں اورقریبی دوستوں کی محفل میں بے تکلیف ہوجاتے تھے۔ہمیشہ صاف اور سچی بات کرتے تھےتعصب اوربغض وعناد سے انہیں شدید نفرت تھی۔مولانا مخالفین کی خوبیوں کا اعتراف بھی فراخدلی اورانصاف سے کرتے تھے۔حق گوئی، بے باکی اورجانب داری ان کی طبیعت کا طرہ امتیاز تھا۔صدق جدید میں مختلف کتابوں پران کا تبصرہ جچا تلااور بڑا بے باک ہوتا۔مصنف کی غلطیوں اوراس کی قلمی لغزشیں دکھاتے بھی ہیں اورجب کسی لفظی یا معنوی خوبی پرنظر پڑتی تو بے اختیار داد بھی دیتے ہیں۔ غرض کہ ان کی ہر عادت اور ہر صفت میں ایک خاص قسم کا اعتدال اورتوازن پایا جاتا تھاوہ ہر اعتبار سے مکمل اور بااصول انسان تھے۔

مولوی عبدالماجد دریابادی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ وقت اور اصول کے بہت پابند تھے۔وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف نماز، عبادات، علمی وادبی کاموں کے لیے وقت کی پابندی تھی بلکہ گھر میں اندر آنے، لوگوں سے ملاقات کرنے، کھانے پینے اور دیگر مصروفیات کے لیے باضابطہ ایک نظام الاوقات تھا جس کے وہ ہمیشہ پابند رہے۔اس قدر

اصول اور ضابطہ کی پابندی بہت کم لوگوں کی زندگی میں دیکھنے میں آتی ہے۔ حتی کہ سفر وحضر میں بھی ان اوقات واصولوں کا خیال رکھتے تھے۔ پہلے سے طے کئے بغیر وہ کسی بڑی سے بڑی علمی، ادبی وسیاسی شخصیت سے بھی ملنے کے روادار نہیں تھے۔ ان کی علمی وادبی زندگی کی کامیابی کا راز یہی تھا۔

نصب العین اور نظریۂ فکر

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک نمایاں اور اہم وصف یہ تھا کہ ان کی ساری زندگی ایک نصب العین اور متعین مقصد کے لیے وقف تھی۔ ان کی زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت تھی۔ جب سے انہوں نے الحاد کے دلدل سے نکل کر ریاض اسلام کا رخ کیا تب سے قوم وملت کی رہبری کو اپنا اولین مقصد بنالیا۔ اور تادم حیات اس پر سختی سے قائم رہے۔ ان کے عہد میں کئی سیاسی اور سماجی انقلابات آئے۔ لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں آئی اور وہ مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔

مولانا ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ اسلام کی تمام شعبہ ہائے حیات کی تعلیمات انہیں عزیز تھیں۔ وہ دین اسلام کی پیروی میں ہی دنیا وآخرت کی کامیابی متصور کرتے تھے۔ جمیل مہدی اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں۔

> ''وہ ایک ایسے مسلمان تھے جو اسلام کو اسلامی زندگی کو اور ہر اس شعبہ کو جو اسلامی تمدن کا مظہر کہا جاسکتا ہے ہر طرح اور ہر طرف کے حملوں سے، کمزوری اور اضمحلال کے ہر امکان سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ نئی تہذیب سے انہیں نفرت نہیں تھی، لیکن اس کے آثار واثرات کے سلسلے میں وہ اتنے چوکنے بلکہ خوف زدہ تھے کہ اس کا سایہ تکان قدموں پر دیکھنا انہیں گوارا نہ تھا جنہیں وہ ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ

اسلامی تمدن کا سرمایہ سمجھتے تھے عورتوں کی بے پردگی کو وہ عفت وعصمت
کے پرانے پیمانوں کی شکست کی ابتداء قرار دیتے تھے اس لیے وہ
زندگی بھر اس کی مخالفت کرتے رہے، عورتوں اور مردوں کے مخلوط مجمع کو
بھی وہ مذہبی تقاضوں کے خلاف اور انحراف کی طرف ایک ایسا اقدام
سمجھتے تھے جس کی زد اس مشرقی زندگی کی قدروں اور حدود کے لیے
نقصان دہ تھی جو انہیں اسلام کے بعد سب سے زیادہ عزیز تھی، دہریت
کے نقصان اور اس کوچہ کی راہ نوردی کے نتائج سے وہ خود واقف تھے
اس لئے اس کا تو سایہ تک وہ افراد و اجتماعیت میں دیکھنا پسند نہ کرتے
تھے، ہندوؤں میں بھگوان داس، گاندھی جی، شرعی پرکاش، جواہر لال
نہرو، ٹیگو پنڈت سندر لال، یہاں تک کہ عرش ملیسانی اور ہری چند اختر
تک کے وہ ممدوح اسی لیے تھے کہ ان لوگوں کا رویہ انہیں اسلام اور
مسلمانوں کے سلسلے میں ہمدردانہ اور فراخدلانہ نظر آتا تھا۔ عرش ملیسانی
اور ہری چند اختر کی نعتیں صدق جدید میں ہمیشہ ''ہندو کی نعت'' کے
عنوان اور تعریفی نوٹ کیساتھ شائع ہوتی رہیں''۔[1]

مولانا کی شخصیت میں قدیم اور جدید کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ آخر عمر میں تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ تلاش حق کے سلسلہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ سے بیعت کی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سامنے اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کی غرض سے زانوئے ادب طے کیا۔ مولانا شمس تبریز خاں مرحوم ان کی شخصیت کے فکری عناصر کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اپنے زہد وتقشّف اور لیے دیے ہوئے رہنے کے انداز سے وہ بقول
شوکت تھانوی ''زاہد خشک''، معلوم ہوتے مگر قریب سے دیکھنے کے

---

[1] جمیل مہدی، مولانا عبدالماجد دریابادی تاثرات وملاحظات مشمولہ نیا دور، اپریل مئی ۱۹۷۸ء، ص: ۲۴، ۳۰

بعد اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت میں جوش وجذبہ اور سوز وگداز کا توازن موجود ہے اور دین وزندگی کے بارے میں وہ ایک معتدل نقطہ نظر رکھتے ہیں، ان سے ملنے والا محسوس کرسکتا تھا کہ وہ بیک وقت شبلی کے علم وادب، اکبر کی مشرقیت، محمد علی کی ملی غیرت اور دینی حمیت، مولانا تھانوی کی روحانیت، سید سلیمان ندوی کی جامعیت اور مناظر احسن گیلانی کے علم واسلامیت سے مستفید ہو رہا ہے۔ وہ غزالی کی طرح 'پیچ وتاب رازی'، کے راستوں سے ہوکر "سوز وساز رومی" تک پہونچے تھے۔ اس لیے ان کی ذات میں مذہب وعقلیت 'دین و دانش اور علم وایمان کا خوشگوار اجتماع ہو گیا تھا۔ وہ مشرقی واسلامی تمدن کا ایک ایسا نمونہ تھے جس میں عقل ووجدان میں ہم آہنگی تھی، فلسفیانہ تدبر وتفکر کے ساتھ مذہب کی حقیقت پسندی اور اقدار واخلاق کی پابندی جمع تھی۔ وہ ایک مجتہدانہ ذوق اور زندگی کے بہت سے مسائل میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے ان کی مشرقیت بھی دلائل وبراہین پر مبنی تھی اور ان کی اسلامیت بھی علم وتلاش حق کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے غزالی وابن رشد اور ابن تیمیہ کی طرح اس برصغیر کو ایک بار پھر اپنی عمر مثال سے یہ دکھا دیا کہ مذہب وعقل میں کوئی تضاد نہیں اور علم کے راستے سے مذہب وروحانیت کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے اور مادیت ومغربیت کی شب تاریک میں ایمان ویقین کا نور ہی قندیل رہبانی ثابت ہوسکتا ہے"۔ [1]

مولانا عبدالماجد کے متعلق ناواقفوں کو شاید غلط فہمی ہو کہ وہ بڑے خشک مزاج اور کٹر مذہبی ہیں۔ جو لوگ ان سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ چیز

[1] شمس تبریز خاں، مولانا عبدالماجد دریابادی تاثرات وملاحظہ مشمولہ نیا دور، اپریل مئی ۱۹۷۸ء ص: ۲۴، ۳۰

حقیقت سے کتنی دور ہے۔ مولوی رئیس احمد جعفری مولانا کے خصوصی معتقدوں مسیں سے تھے۔ ان کی تحریری شہادت اس سلسلہ میں خاص وزن رکھتی ہے۔ وہ اپنی کتاب ''دیدوشنید'' میں لکھتے ہیں۔

''ایک بڑی چیز ہے توازن۔ کم لوگ ایسے ہیں جو اس نعمت سے بہرور ہیں۔ افراط میں مبتلا ہیں یا تفریط میں۔ مولانا کو خدا نے توازن کے ساتھ وہ سلامتی فکر عطا کی ہے جو افراط و تفریط سے بہت دور ہے۔ وہ کٹر حنفی ہیں۔ لیکن غیر مقلدوں کے دشمن نہیں۔ وہ سیاسیات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے قائل ہیں۔ لیکن نیشلسٹوں کو اچھوت نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے سنی ہونے پر ناز کرتے ہیں لیکن شیعوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ جس کے مخالف ہیں اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ وہ ظاہر کو بھی دیکھتے ہیں اور باطن کو بھی۔ وہاں میں سے کسی ایک پر فیصلہ نہیں کر دیتے۔ ان کا فیصلہ ہر دو پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی ہیں۔ ہنستے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ روتے ہیں تو آنکھیں سے آبدار موتیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ہنساتے ہیں تو فضا کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔ رُلاتے ہیں تو دل میں گداز و سوز پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس نشاط حیات بھی ہے اور فکر آخرت بھی۔ وہ فکر آخرت پر نشاط حیات کو قربان نہیں کرتے۔ اور فکر آخرت کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ آخرت کی فکر بھی کرتے ہیں اور زندگی سے لطف بھی لیتے ہیں وہ ورزش بھی کرتے ہیں واکنگ بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں، رات کو جاگتے بھی ہیں اور سوتے بھی ہیں دن کو آرام بھی کرتے ہیں اور کام بھی۔ جاگنے کے وقت جاگتے ہیں، سونے کے وقت سوتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کی ہر چیز میں ایک اعتدال ہے، توازن ہے ایک کامل المعیار انسان ہیں اس سے

زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔[۱]

مولانا عبدالماجد کا ایک اصول و دستور یہ تھا کہ جس چیز کو صحیح اور بہتر سمجھتے تھے بے جھجک ، نہایت جرأت و بیباکی اور بڑی بے خوفی سے اس کا اظہار کرتے تھے کسی کی عظمت، اس کے عہدہ ومنصب کی بڑائی خاندانی وجاہت، علمی وادبی شہرت اور غیر معمولی اثر ورسوخ بھی ان کو راہ صادقت اور جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں کرسکتا تھا، ان کا قلم، سچ اور صداقت کے علاوہ حکمت عملی کا شکار ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ سچ اور جھوٹ کے معاملہ میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور نہ رائے عامہ سے مرعوب اور خائف ہوتے تھے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مختصر یہ کہ بحیثیت انسان ایک ایسے عظیم المرتبت انسان تھے جو شرافت وانسانیت، حسن اخلاق و کردار بلکہ رفتار و گفتار میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے اُٹھ جانے کے بعد ہماری دنیائے علم وادب اور عالم شرافت واخلاق میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو مدتوں تک پورا نہیں ہوسکتا ہے۔ شاعر ایسے ہی غیر معمولی انسانوں متعلق شاعر نے کہا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
میرؔ

مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں بہت سے معاصر شعراء کرام نے اپنے کلام کے ذریعہ نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہاں پر صرف دو منتخب شاعروں کا کلام پیش کیا جارہا ہے۔ ان نظموں میں موجود شاعر سے مولانا دریابادی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، گویا شاعر نے سمندر کو گوزے میں بند کرنے سعی کی گئی ہے۔

[۱] مولوی رئیس احمد جعفری مولانا عبدالماجد دریابادی، ایک کامل المعیار انسان، مشمولہ فروغ اردو لکھنؤ ماجد نمبر، ص:۵۸

اے ادیب ایشیا

ضیا ھانی

اے مفسر! اے محقق! اے خطیب خوش بیاں
اے جلیل القدر ناقد! اے حکیم نکتہ داں!

اے مفکر! اے مبصر! اے وطن کے پاسباں!
اے عظیم المرتبت! اے قوم کے روح رواں!

اے ادیب ایشیا! اے نازشِ ہندوستاں!
طول و عرض ملک میں لاکھوں ہیں تیرے قدرداں

اے کہ تیری ذات ہے، سرمایہ صد افتخار!
رشک کے قابل ہے تیرا خامۂ معجز نگار!

تیری عظمت سے کوئی انکار کر سکتا نہیں!
کوئی سورج کو پسِ دیوار کر سکتا نہیں،

تیرا اک اک حرف ہے علم و ادب کا شاہکار
تیرے ہی دم سے ہے قائم آج "اردو" کا وقار

تو نے سچائی کو بخشی ہے حیاتِ پائیدار
ناز فرماتی ہے جس پر رحمتِ پروردگار

علم و فن کی تو نے خدمت کی ہے ستر سال تک
تیرے مداحوں میں تھے آزاد اور اقبال تک

تو نے "فن نقد" کو بخشی وہ معراج کمال
جس کو کہہ سکتے ہیں، اربابِ بصیرت لازوال

سانس لیتا ہے اسی دنیائے آب و گل میں تو!
باتیں، یوں کرتا ہے گویا ہے ہمارے دل میں تُو

تیری ہر تحریر ہے مہر و محبت کی کتاب
تیرا ہر اک لفظ ہے گویا صداقت کا رباب

تیری ہر تصنیف حکمت کا چھلکتا جام ہے
مجتہد ہے، ندرتِ اسلوب تیرا کام ہے

دور کرنا چاہتا ہے دہر سے بغض و عناد
تیرا نعرہ "اتحاد و اتحاد و اتحاد"

کس قدر لطف بیاں ہے کس قدر سوز و گداز
ہیں تیری "تحریر" میں بکھرے ہوئے دنیا کے راز

تجھ کو دنیا کی خبر ہستی کا ہے عرفان بھی
تیری نظروں میں بشر کی انقلابی شان بھی

دیکھتا ہے عالم ایجاد کی ہر واردات
تو بہر لمحہ، کیا کرتا ہے "تنقید حیات"

کارناموں کو تیرے دنیا بھلا سکتی نہیں
نقش جو تو نے بنایا اسے مٹا سکتی نہیں

سبز ہے تیری عرق ریزی سے "اردو" کا چمن!!
گل بداماں ہے تیرے دم سے "ریاض علم و فن"

مولانا عبدالماجد دریابادی

عمر انصاری

زباں ایسی، گماں ہو جس پہ دریا کی روانی کا
بیاں ایسا کھنکتے ہوں کہیں جام و سبو جیسے

تفکر اور تخیل کی اداکاری کا ہر منظر
خراماں نور و نکہت ہوں چمن میں چار سو جیسے

ہر اک سادہ سے مضموں میں بھی اس انداز کے تیور
اٹھا ہو، لے کے انگڑائی ابھی ایک ماہ رو جیسے

وہ الفاظ و معنی کی صدا دیتی ہوئی دنیا
کسی کھلتے ہوئے گلزار کا جوشِ نمو جیسے

بیانِ فلسفہ ہو یا حدیثِ علم و حکمت ہو
قریبِ دل کسی سے ہو رہی ہو گفتگو جیسے

اشاروں، استعاروں اور کنایوں کے وہ میخانے
سرِ دستِ حنائی ساغر و جام و سبو جیسے

مناظر وہ مسائل کی برافگندہ نقابی کے
کھڑا ہو حسن آئینے میں اپنے روبرو جیسے

ہر اک فکر و نظر کے آئینہ خانے کا وہ عالم
رواں باہم دگر ہو کاروانِ رنگ و بو جیسے

جنونِ شوق کی ہر ہر قدم وہ شعلہ سامانی
ہو صدیوں سے کسی کو آپ اپنی جستجو جیسے

جہاں میں بس تھی یوں ہی حضرت ماجد کی ہستی بھی!
زباں ہائے زمانہ میں زبانِ لکھنؤ جیسے
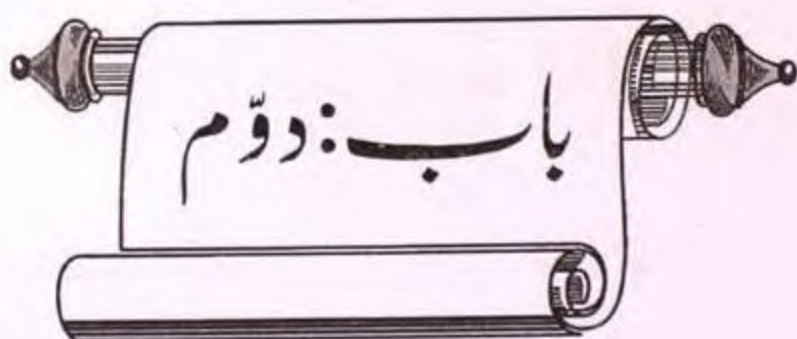
عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات

عبدالماجد دریابادی کی صحافتی خدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کے جہاں بہت سے پہلو اور حیثیتیں ہیں وہیں ایک اہم اور عظیم حیثیت بطور صحافی کے بھی نمایاں ہے، جس کے باعث وہ مدتوں یاد رکھے جائیں گے۔ وہ ایسے بلند پایہ صحافی تھے جن کے لیے صحافت پیشہ یا کاروبار نہ تھا بلکہ عبادت اور مشن تھی۔ صحافت سے ان کی وابستگی عمر کے بارہویں سال میں ہوئی اور اپنی وفات سے چند ماہ قبل تک، وہ اس سے پوری طرح وابستہ رہے۔ اس طویل مدت میں جو نصف صدی سے کچھ زائد عرصے پر محیط ہے۔ ان کے گوہر بار قلم نے فضائے صحافت میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے بے شمار علمی ادبی، سیاسی اور مذہبی مضامین لکھے۔ کئی کتابوں پر تنقید و تبصرہ کیے۔ بہت سی فکری لڑائیاں لڑیں۔ کئی معاصرین سے علمی و ادبی معرکے ہوئے۔ نام نہاد مسلمانوں کو حقیقی اور عملی مسلمان بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ غرض کہ صحافت کے ذریعہ سب کچھ کیا جو ایک قائد، ایک رہبر اور ایک مصلح اپنی قوم وملت کے لیے کر سکتا ہے۔

یہاں اس صحافتی پس منظر کا اجمالی ذکر نہایت ضروری ہے جس کے سایہ میں عبدالماجد کے قلم نے چلنا سیکھا۔ اس کے ساتھ مضمون کی مناسبت سے صحافت کی تعریف، اہمیت اور مختصر تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صحافت کی تعریف

صحافت عربی زبان کے لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی صفحہ یا رسالہ ہے۔ انگریزی میں جرنلزم، جرنل سے ماخوذ ہے یعنی روزانہ کا حساب یا روزنامچہ۔ صحافت کسی بھی معاملے کے بارے میں تحقیق یا پھر سامعین تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے بشرطیکہ اس سارے کام میں نہایت ایمانداری اور مخلص پن کا عنصر ضرور موجود ہو۔ صحافت نام ہے لوگوں کی رہنمائی کرنے کا۔ صحافت نام ہے تبصروں کے ذریعہ عوام الناس کو حقائق سے روشناس کرانے کا۔

لفظ ''اخبار'' خبر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی بھی حادثے کا بیان کرنا یا اس کی تفصیل فراہم کرنا۔ دوسرے لفظوں میں ''ضروری جانکاری یا خبر'' اگر لغت کے حوالے سے بات کی جائے تو لفظ ''خبر'' کے معنی آگے بڑھنا، چلنا، کسی کام یا کاروبار کی اطلاع، حال چال، خیر وعافیت، کسی ایسے حادثے کی اطلاع جس کے متعلق لوگوں کو جانکاری نہ ہو، بات چیت، مطلع کرنا وغیرہ بھی خبر کے معنی میں مستعمل ہیں۔ انگریزی اس کے لیے ''نیوز'' News کا لفظ مستعمل ہے۔ روشن رومانی اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

> نیوز کا لفظ ''1550ء کے قبل ہوا تھا۔ البتہ اس سے بھی سوا سو برس پہلے یہی لفظ ذرا سی ردوبدل کے ساتھ مستعمل تھا۔ مثلاً تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۲۳ء میں NEWS 1455ء میں NEWYES اور 1523ء میں NEWES لفظوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی ابتداء سے جڑی کچھ اور باتیں ہیں، جیسے NEWS لفظ سے کیا مراد ہے۔ اس چار حروف کا منطقی جواز کیا ہے، اس معمہ کو سلجھانے کے لیے ذرائع ابلاغ کی تاریخ میں دو طرح کے خیالات ملتے ہیں۔ پہلے خیال یہ ہے کہ NEWS کے چاروں

حروف چار مختلف سمتوں کو بیان کرتے ہیں، یعنی N سے نارتھ، E سے ایسٹ، W سے ویسٹ اور S سے ساؤتھ۔ جو ماہرین اس تشریح کے حامی ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ ''خبر'' چہار جانب موجود ہے اور وہ کسی جانب سے آسکتی ہے یعنی مشرق، مغرب، شمال و جنوب۔ دوسرا خیال اس سلسلے کا یہ ہے کہ انگریزی لفظ ''نیوز'' کا دوسرا مطلب ''نیوز'' یعنی ''نیا'' ہے جس کی جمع شکل ''نیوز'' ہے یعنی ''نیوز'' سے مراد نئے نئے حادثے نئی نئی بات سے ہے۔ انگریزی کا لفظ ''نیو'' لیٹن زبان کے ''نووا'' سے مستعار ہے اور لیٹن کا لفظ ''نووا'' سنسکرت زبان کے ''نَو'' لفظ سے لیا گیا ہے۔ اس طرح نو، نووا یا نیو تینوں کا مطلب بالترتیب ''نوین'' نیا اور تازہ ہوا۔[۱]

صحافت کی اہمیت و افادیت

جدید دنیا کی تہذیبوں میں، جن شعبوں کی ترقی بہت اہم سمجھی جاتی ہے ان میں سے ایک صحافت بھی ہے۔ برطانیہ میں تو چار چیزوں کو سب سے بڑی طاقتیں مانا جاتا ہے۔ بادشاہت، حکومت، پارلیمنٹ اور اخبار اور پھر جمہوریت، جس میں ہم رہتے ہیں اس کے لیے تو اخبار وہی کام دیتے ہیں جو دل کے لیے خون پہنچانے والی نالی انجام دیتی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جمہوریت کی بنیاد ہی ملک کے اچھے اخباروں پر ہوتی ہے۔

آج کا دور جمہوری دور ہے اور جمہوریت اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جمہوری ممالک میں صحافت کو مملکتی تنظیم کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ تقریباً ساری دنیا میں اخبارات نہ صرف ترسیل اطلاعات کا ذریعہ ہیں، بلکہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کی کارکردگی پر بھی تنقید، تبصرہ اور رائے زنی کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب جتنی ترقی کرتی جارہی ہے صحافت کا

---

[۱] روشن رومانی 'ذرائع ابلاغ کی تحریری'؛ صفحہ ۱۷، ۱۸

کردار اتنا ہی زیادہ مضبوط اور اہم ہوتا جارہا ہے۔ مغربی دنیا چونکہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، لہٰذا وہاں پر صحافت بھی بڑی سرعت سے بام عروج کی جانب رواں دواں ہے۔ مغربی ممالک جیسے امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں اخبار کی تقریباً وہی اہمیت ہے جو غذا کی ہے اور وہاں کے لوگ اخبارات کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے۔

ہندوستان میں صحافت کی تاریخ

ہندوستان میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارھویں صدی کی آٹھویں دہائی سے ہوتا ہے۔ ۲۹ رجنوری ۱۷۸۰ء کو کلکتہ سے جیمس آگسٹس ہکی نے انگریزی زبان کا ہفت روزہ ہکیز بنگال گزٹ Hicky's Bengal Gazeete یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر شائع کیا تھا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد ابتدائی خبروں سے گھبرا اٹھے، لارڈ ولسی نے 1799ء میں ایک حکم جاری کیا کہ ہر اخبار اشاعت سے پہلے گورنمنٹ کے سکریٹری کو دکھالینا ضروری ہے۔ سکریٹری کو اختیار حاصل تھا کہ جس عبارت کو وہ قابل اعتراض سمجھے قلم زد کردے۔ 1936ء میں اخباروں کے اوپر سے پابندیاں ہٹالیں اور ایک حد تک ان کو اظہار رائے کے لیے آزادی دی۔ بنگالی گرٹ کے بعد 1780ء میں انڈین گزٹ شائع ہوا۔ پھر 1784ء میں کلکتہ گزٹ نکلا اور 1885ء میں بنگال جرنل شائع ہوا۔

ملکی زبانوں میں سب سے پہلا اخبار بنگالی زبان میں جاری ہوا۔ یہ اخبار گہرام پور کے عیسائی مشنریوں نے نکالا تھا۔ اس کا نام ڈگ درسن تھا یہ ایک ہوا۔ رسالہ بھتا جو اپریل 1818ء میں شائع ہوا۔ دو نمبر نکلنے کے بعد جب اس کے منتظمین کو اطمینان ہوگیا کہ باوجود سیاسی خبروں کے حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں یا تو انہوں نے ایک ہفت وار اخبار ''سماچار درپن'' بنگالی زبان میں شائع کیا یہ اخبار جب نارڈ ہیسٹنگس کی نظر سے گذارتی انہوں نے سہرام پور کے مشنریوں کی بہت ہمت افزائی کی اور ان سے درخواست کی

کہ اس اخبار کا ایک فارسی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور مغلوں کی حکمرانی کو کمزور کرنے کی غرض سے 1830ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔ اس عمل کا بالواسطہ اثر اردو زبان پر بڑا مفید اور خوشگوار پڑا۔ اس زبان کو نہ صرف ذریعہ تعلیم وتدریس کی حیثیت سے فروغ حاصل ہوا بلکہ عدالتوں اور دفاتر میں بھی اردو میں کام ہونے لگا۔ ساتھ ساتھ اردو صحافت کی زمین میں بھی تیزی سے زرخیزی آنے لگی۔

اُردو صحافت کا آغاز وارتقاء

28 مارچ 1822ء کو 'جام جہاں نماء' کا پہلا نمبر شائع ہوا یہی گو یا سما چار درپن کا ایڈیشن تھا اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ اس اخبار کا آدھا حصہ فارسی میں تھا اور آدھا اردو میں۔ یہی اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا، اس سے ظاہر ہے کہ ''اردو اخبار جو مولوی محمد باقر صاحب نے 1836ء میں دہلی سے شائع کیا اردو کا پہلا اخبار نہ تھا جیسا کہ ان کے لائق فرزند مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بیان کیا ہے۔ بلکہ جام جہاں نماء اردو کا پہلا اخبار تھا جو اردو اخبار سے چودہ برس پہلے نکلنا شروع ہوا تھا۔ امداد صابری کی تحقیق بھی یہی ہے کہ ''جام جہاں نماء'' اردو کا پہلا اخبار ہے۔ ابتداء میں اس کے چند پرچے اردو میں نکلے بعد میں وہ فارسی میں نکلنے لگا اور دوبارہ اردو کا ضمیمہ ۱۸۲۳ء کو نکلنا شروع ہوا''۔[۱]

بعض محققین کا خیال ہے کہ اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' نہیں، بلکہ ٹیپو سلطان شہید کا 'فوجی اخبار' تھا، جو سلطان ٹیپو نے اپنی شہادت سے پانچ سال اور 'جام جہاں نما' سے کم وبیش اٹھائیس سال قبل ۱۷۹۴ء میں جاری کیا تھا۔ مولانا اسماعیل پانی پتی نے اپنے ایک مضمون 'اردو کا سب سے پہلا اخبار اور ٹیپو سلطان' (مطبوعہ رسالہ بصائر جنوری، اپریل

---

[۱] امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول: ص:۹۶

وجولائی ۱۹۶۴ء) میں، ڈاکٹر محمد صادق نے 'ہسٹری آف اردولٹریچر' میں، محمد سعید عبدالخالق نے اپنی کتاب ''میسور میں اردو' (مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۴۲ء، صفحہ ۷۴۔۷۷) میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اردو کا پہلا اخبار سلطان ٹیپو شہید نے جاری کیا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی نے بھی 'سیرت ٹیپو سلطان شہید' (ندوہ لکھنؤ، صفحہ ۴۹۶) میں اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''سقوط سرنگا پٹنم کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی فائلوں کو چن چن کر جمع کر کے آگ لگادی۔'' اس لئے آج دنیا میں اس کا کوئی ایک شمارہ بھی دستیاب نہیں ہے۔

ہر چند کہ یہ موضوع ہماری تحقیق کا نہیں ہے تاہم اس بات کی ضرورت باقی ہے کہ ٹیپو سلطان کو اردو صحافت کا موجد قرار دینے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس پر مزید تحقیق کی جائے۔ جب تک اس کے متعلق ٹھوس شواہد دستیاب نہیں ہوجاتے، تب تک ''جام جہاں نما'' ہی کو اولیت کا مقام حاصل رہے گا۔

''جام جہاں'' نما نے خاصی لمبی عمر پائی۔ یہ ۱۸۷۶ء تک کم وبیش پچپن سال جاری رہا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لعل تھے جو مرزا پور کے رہنے والے تھے اور ناشر کلکتہ کی ایک انگریزی تجارتی کوٹھی ولیم پیٹرس ہاپ کنس اینڈ کمپنی تھی۔ یہ اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار تھا، اس کے اجراء سے اردو کے نثری اور شعری ادب کے فروغ کے دروازے کھل گئے اور جرأت مندانہ دیسی صحافت کی داغ بیل پڑی۔

اردو کے نثری اور شعری ادب بطور خاص ہندوستانی صحافت کے قائدانہ رول اور رہنمایانہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''جام جہاں نما ہماری دیسی صحافت کی وہ اولین دستاویز ہے جس میں آج کے اخبار کی شکل اور تقطیع، اور صحافت کی نثر، خبروں کی تحریر،

کالموں کی ترتیب، سرورق کے مشمولات اوررائے زنی کے انداز کی
پوچھٹی۔انیسویں صدی کے پہلے نصف میں جاری ہونے والے اردو
کے بیشتر اخبار اسی کے نقوش پر چلے۔"[۱]

حامداللہ افسر نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے بعد 6 مئی 1823ء کو ماتھر موہن مرنے "شمس الاخبار" جاری کیا یہ اخبار بھی فارسی اور اردو میں تھا یہ اردو کا دوسرا اخبار تھا۔

ان کا کہنا ہے کہ اس تحقیق سے ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار ایک ہندو بزرگ کی ادارت پر شائع ہوا اور اس کے بعد اردو کا دوسرا اخبار بھی ایک ہندو بزرگ ہی نے نکالا گویا اردو اخبار کی بنا اصل میں ہندو اصحاب نے ڈالی۔

1836ء میں مولوی محمد باقر صاحب نے "اردو اخبار" جاری کیا، اس اخبار میں زیادہ تر قلعہ معلیٰ کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔مولوی محمد باقر اپنے علم وفضل کے لیے دہلی میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

مولوی باقر کے اس اخبار کے نام میں کئی بار تبدیلی کی گئی۔ ۱۸۳۷ء میں اجراء کے وقت اس کا نام "دہلی اخبار" تھا۔ ۱۰ مئی ۱۸۴۰ء میں اس کا نام "دہلی اردو اخبار" کردیا گیا۔ پھر ۱۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو یعنی جنگ آزادی شروع ہونے کے تقریباً دو ماہ بعد اس کا نام "اخبار الظفر" رکھ دیا گیا۔ نام کی یہ آخری تبدیلی غالباً مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کی خواہش کے احترام میں کی گئی تھی۔ ۱۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء تک اخبار اسی نام سے چلتا رہا۔ اس دوران دہلی شہر مکمل انقلاب کی نذر ہو چکا تھا اور اب اخبار کا مزید جاری رہنا ناممکن ہوگیا۔ لہٰذا ۱۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کا شمارہ ہی آخری شمارہ ثابت ہوا۔ واضح رہے کہ یہ اخبار شروع سے آخر تک ہفت روزہ ہی رہا۔ مولوی باقر کو جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کی گولی کا نشانہ بننا پڑا اور اس

[۱] ڈاکٹر گیان چند، اردو صحافت کا سفر، ص ۷۶، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

اعتبار سے انہیں جنگ آزادی کا پہلا شہید صحافی گردانا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران مولوی باقر کے اخبار نے انتہائی بے باکی اور دلیری سے قلم کی جنگ لڑی اور انگریزوں کے مظالم اور جابرانہ حکمت عملی کا خوب پردہ فاش کیا۔ انھوں نے اپنے اخبار میں علمائے کرام کا ایک فتویٰ بھی شائع کیا جس میں غدر کو عین جہاد قرار دیا گیا تھا۔

> ''غدر سے پہلے دہلی سے نکلنے والا دہلی، اردو اخبار، اردو کا سب سے باا ثر عمدہ اور دلیر اخبار تھا جسے محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے جاری کیا تھا جو غدر کے بعد انگریزوں کی مخالفت اور جہاد آزادی کی حمایت کرنے کی پاداش میں شہید کر دیے گئے اور حق کی راہ میں جان دینے والے پہلے اخبار نویس ہوئے۔''[۱]

''دہلی اردو اخبار' کے علاوہ ایک اور اخبار جس کو جنگ آزادی کی دوران بڑی شہرت حاصل ہوئی، وہ سید جمیل الدین خاں ہجر کا شائع کردہ ''صادق الاخبار' تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد جب مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر پر انگریز نے مقدمہ چلایا تو استغاثہ کی جانب سے بادشاہ پر انقلاب کی قیادت کا الزام ثابت کرنے کے لیے اسی اخبار کی خبروں کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ دہلی اردو اخبار' صادق الاخبار دونوں ہی نے جنگ آزادی کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی لیکن اوّل الذکر نے اپنی تحریروں میں انگریز کی مسلم دشمن سرگرمیوں کا پردہ چاک کیا جب کہ بعد الذکر نے مجاہدین کے کارناموں کو اجاگر کیا اور لکھا کہ مغل بادشاہ اور اس کی فوج یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوگی کیونکہ اسے رضائے الٰہی حاصل ہے۔

بہر حال یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان میں اردو صحافت کی باقاعدہ ابتدا مئی 1822 میں ''جام جہاں نما'' ہفتہ وار اخبار سے ہوئی۔ اردو صحافت، اخبار یا خبرنامہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ایجادوں کی طرح ہی اس کی

---

[۱] انور علی دہلوی، اردو صحافت عہد بہ عہد، مشمولہ اردو صحافت: ص:۴۶

تاریخ بہت ہنگامہ خیز رہی ہے انیسویں صدی میں ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جدو جہد کا سہرا اردو صحافت ہی کے سر ہے۔ اردو کے اخبارات ہی نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کا ثبوت ایک نامور صحافی اور مدیر مولوی محمد باقر کی شہادت سے ملتا ہے۔ اردو اخبارات کے مدیران انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ پریسوں پر چھاپہ مار کر تالے ڈال دیئے گئے۔ ان سب اذیتوں کے باوجود وہ انگریزوں کے ظلم وستم کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دوسری زبانوں میں اخبار بہت کم تھے اور انگریزی اخبار انگریزوں کے حامی اور ہم نوا ہوا کرتے تھے۔ لہذا اردو اخبارات اور اردو صحافیوں ہی نے برطانوی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہوں نے سیاسی بیداری اور تحریک آزادی میں سب سے نمایاں رول ادا کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل قابلِ ذکر اخباروں میں ''فوائد الناظرین''، ''قرائن السعدین'' اور ''اسعد الاخبار'' کے علاوہ ہرسکھ رائے کی ادارت میں نکلنے والا ''کوہ نور'' شامل ہیں۔ ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء تک اردو کے جو اخبار نکلتے اور بند ہوتے رہے ان کا شمار ایک مشکل امر ہے۔ مگر ان اخبارات نے جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی کافی عرصہ تک جلا بخشتی رہی۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوستان ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوا۔ اردو صحافت نے ایک نئی کروٹ لی۔ اب حالات بدل چکے تھے اور پورا ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آ گیا تھا۔ زوال ادبار اور واہمہ شکنی نے صحافت کی نفسیت کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے پُرآشوب دور میں لکھنؤ سے ''اودھ اخبار'' جاری ہوا۔ اگرچہ اودھ اخبار سے پہلے لکھنؤ ہی سے ''لکھنو اخبار'' نکل چکا تھا جسے امداد صابری نے لکھنؤ کا پہلا اخبار لکھا ہے اور دوم ''طلسم لکھنؤ''، جو فرنگی محل سے ۱۸۵۶ء میں نکلا۔[۱]

[۱] امداد صابری، تاریخ صحافت اردو جلد اول، ص: ۳۳۵

۱۸۶۶ء سے اردو صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز سر سید احمد خاں کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی سے ہوا۔ اس اخبار کا اختصاص دولسانی تھا۔ اس اخبار کے توسط سے سرسید احمد خاں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جو شکوک اور تعصبات جگہ پا گئے تھے اسے دور کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ افہام و تفہیم کی راہ ہموار ہو اور ترسیلی خلا دور ہو سکے۔

اصغر عباس صاحب لکھتے ہیں:

''اس اخبار کے دو کالم رکھے گئے۔ ایک انگریزی میں، دوسرا اردو میں ہوتا تھا۔ اس کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ اس کے ذریعے ہندستانی اور انگریز ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھیں اور باہم ارتباط پیدا ہو''۔

یہ دور ہندوستانی اخبارات خصوصاً اردو اخبارات کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت مسلمانوں پر انگریز حکمرانوں کا عتاب شدت سے نازل ہو رہا تھا اور نتیجتاً مسلمان کافی خائف تھے۔ لیکن اس دورِ باطل میں بھی سرسید احمد خان کا صحافیانہ قلم انتہائی بہادری اور بے باکی سے چلتا رہا اور انھوں نے بے لاگ رائے زنی کر کے صحافت کو ایک نئی سمت دکھائی۔ جنگ آزادی کے بعد ابتداء میں اردو اخبارات سیاسی مسائل پر بحث کرنے میں محتاط رہے لیکن رفتہ رفتہ خوف و احتیاط جاتے رہے۔ مجموعی طور پر پالیسی کے لحاظ سے ان کا رویہ حکومت سے وفاداری کا رہا لیکن اہم مسائل پر عوام الناس کے مطالبات اور جذبات کی انھوں نے بھرپور ترجمانی کا حق ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک ۴۳ سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے اس دور کی خاص بات یہ رہی کہ ہفت روزہ اخبارات نے ترقی کر کے روزناموں کا روپ دھار لیا۔ اس دور کی اردو صحافت میں خصوصاً سرسید احمد خان کا نام سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ جنہوں نے اپنی بے لاگ و بے باک صحافت کے ذریعہ ہندوستانی معاشرے میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس طرح لوگوں میں سیاست، معیشت، تاریخ، زبان اور تہذیب و تمدن کے بارے میں میں جاننے کی جستجو پیدا ہونے لگی۔

برطانیہ سے واپسی کے بعد سرسید احمد خان نے ایک خالص علمی جریدہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ انیسویں صدی کا نصف آخر اردو زبان کی تاریخ کا وہ روشن زمانہ ہے جب اس پر انگریزی زبان وادب کے اثرات مرتب ہوئے۔ اسی زمانے کو اردو صحافت کا دور جدید بھی کہا جاتا ہے، سرسید احمد خاں، ان کے رفقا اور معاصرین نے اس عہد میں اردو زبان کے ہمہ جہت ارتقا کے لیے راہ ہموار کی اور اس کے نشوونما میں بھرپور حصہ لیا۔ انہیں دنوں دہلی میں اردو کے متعدد اخبار نکالے گئے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک کا زمانہ اردو میں صحافت کے فروغ اور ترقی کا زمانہ ہے۔ اس زمانے تک جہاں اردو زبان میں خود ان گنت اصطلاحات اور تراکیب، الفاظ نے جنم لیا وہیں غیر ملکی زبانوں کے بھی ہزاروں الفاظ ابلاغ کی ضرورتوں کے تحت ہماری زبان میں آ گئے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے دہلی اردو اخبار کے چند ابتدائی پرچوں کا جائزہ لے کر انگریزی کے متعدد الفاظ جمع کئے ہیں، جو انیسویں صدی کے وسط تک اردو زبان میں بے تکلف استعمال کیے جاتے تھے۔ الفاظ جیسے پولیس، اسٹامپ، مجسٹریٹ، لیفٹیننٹ وغیرہ وغیرہ۔ زبان اپنے تعمیری عہد میں دروازے کھلی رکھتی ہے اور وہ عصری شعور کی ترجمانی کا فریضہ اسی وقت ادا کرسکتی ہے جب ہر قسم کے تعصّبات سے بالاتر ہوکر نئے افکار اور عملی پیش رفت کا ساتھ دے سکے۔

اردو میں اس نظریے کی اشاعت سب سے پہلے سرسید کے مضامین کے ذریعے ہوئی تھی اور سرسید نے ہی ایک سائنسی اسلوب کی بنیاد ڈالی تھی جو کہ جدید صحافت کے لیے موزوں اور مناسب تھا۔ اردو صحافت کے ترقی پذیر دور میں صحافیوں نے ان تمام باتوں کا خیال رکھا جن سے زبان کو فروغ حاصل ہو۔ سرسید نے اپنے عہد میں مفید صحافتی کارنامے انجام دئے۔ غازی پور میں انہوں نے جو سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اسی نام سے اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی'' بھی جاری کیا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی اس کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ ان سب کوششوں میں اہم اور نمایاں درجہ تہذیب الاخلاق کو حاصل ہوا، کیونکہ اس میں علمیت زیادہ تھی۔ اس

کے مضامین عام اور سطحی اخباری دلچسپی سے زیادہ قوم کو گہرے ذہنی انقلاب کے لیے تیار کرنے میں مدد دیتے تھے۔

انیسوی صدی کی ساتویں دہائی کے دوران اردو صحافت کی ترقی میں ایک اور بڑی پیش رفت ہوئی۔ یعنی اردو اخبارات میں اداریے لکھنے کا رواج عام ہونا شروع ہو گیا اور اس بات کا سہرا بھی سرسید کے سر جاتا ہے جنہوں نے اپنے اخبار سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق میں اداریے لکھنے کی روایت ڈالی۔ اس سے قبل اردو صحافت میں اداریے لکھنے کا رواج نہ کے برابر تھا۔ مذکورہ صدی کے آخری حصے میں ایک بڑی تبدیلی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ وہ اخبارات جو کافی عرصے سے ہفت روزہ یا سہ روزہ کی شکل میں نکل رہے تھے اب روزنامے بن چکے تھے۔

سرسید احمد خاں کے بعد بھی ان صحافیوں نے اردو زبان کے فروغ میں حصہ لیا، جن کے ذہنی دریچے کھلے ہوئے تھے۔ صحافتی مضامین کا کمال یہ ہے کہ ان میں نہ صرف حالیہ زندگی کی نبض دھڑکتی ہوئی محسوس ہو بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی بھی نشاندہی ہونی چاہیے۔ جن صحافیوں نے اس معیار کو پیش نظر رکھا وہ زبان کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کی خدمت کا بھی حق ادا کر گئے۔ سرسید احمد خاں کے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو پرانے خیالات سے نکالا جائے اور جدید علوم وفنون کی طرف لوگوں کو راغب کیا جائے۔

فارسی زبان کو مسلمان ترک کر چکے تھے۔ صرف اردو زبان ہی اظہار کا واحد ذریعہ تھی جس کے ذریعے مسلمانوں کو حالات کی سنگینی کا ادراک کرویا جا سکتا تھا۔ ان تمام حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلم رہنماوں نے اردو صحافت کو پروان چڑھایا اور اخبارات کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے کی ٹھانی۔ سرسید احمد خان نے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کر

کے میدان عمل میں قدم رکھا۔ سر سید کا مقصد یہ تھا کہ مسلماوں اور انگریزوں کے درمیان خلیج کو ختم کر کے خوشگوار تعلقات قائم کئے جائیں۔ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم سے آشنا کیا جائے تا کہ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل سکیں اور ایسا نہ ہو کہ مسلمان سیاسی اچھوت بن کر رہ جائیں۔

غالباً یہی وہ دور تھا جب صحافت کو پیغمبری پیشہ کہا گیا۔ کیونکہ سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ بدحالی کی حالت میں تھا۔ تہذیبوں کے تصادم سے تذبذب کی کیفیت تھی۔ اس ناساز صورتحال پر قابو پانے کے لیے صحافت کا سہارا لیا گیا اور مسلمان رہنماؤں نے مختلف اخبارات، رسائل اور جرائد کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ سر سید احمد خان کا اخبار سائنٹفک سوسائٹی ہو یا رسالہ تہذیب الاخلاق'' مولانا ظفر علی خان کا زمیندار ہو یا مولانا محمد علی کا ہمدرد' ان تمام اخبارات نے سیاسی، سماجی اور علمی نظریات کو عوام تک پہنچایا اور اپنی تحریروں سے مسلمان قوم کو بیدار کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخبارات کی تعداد بھی بڑھتی گئی'' مولانا عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خان اور آغا شورش کاشمیری جیسے کئی نابغہ روزگار صحافت کے میدان خارزار میں اترے اور مخالفین پر الفاظ کے نشتر برساتے رہے۔

اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی کا رسالہ ''اردوئے معلیٰ''، اسی علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اسی وقت مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ''لسان الصدق'' کے ذریعہ میدان صحافت میں قدم رکھا۔ ان دونوں نے صحافت اور آزادی کی جدوجہد میں بے مثال قربانیاں بھی دیں۔ مولانا آزاد نے بعد میں ہفتہ وار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' جاری کیا۔

اردو صحافت کی روایات کی توسیع وترقی کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بے حد اہم اور ممتاز ہے۔ جنھوں نے ایک ایسی حیات آفریں نثر قلم بند کی جس کے پیش نظر سجاد

انصاری نے انہیں ''فوق البشر'' قرار دیتے ہوئے تحریر کیا کہ اگر قرآن نہ نازل ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔'' مصور اخبار ''الہلال'' کا پہلا اجرا ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ دوبارہ یہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' کی صورت میں سامنے آیا۔ ''البلاغ'' ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ گیارہ سال کے وقفے کے بعد ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کو پھر ''الہلال'' کی تجدید ہوئی اور اسی سال ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو یہ بند ہو گیا۔

مولانا آزاد نے اپنی صحافت کو ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔ صحافت کی راہ انہوں نے تجارت اور منفعت کی نیت سے اختیار نہیں کی تھی بلکہ اس کے ذریعہ وہ باطل اوہام کی تاریکیوں کو دور کر کے ایک نئی اور روشن صبح کا اُجالا لانا چاہتے تھے۔ قومی وملی بیداری پیدا کرنے آرزومند تھے۔ مولانا ہفتہ وار ''الہلال'' کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صحافت رائے عامہ میں انقلاب برپا کرنے کا ایک موثر اور طاقتور وسیلہ ہے اور اس کے ذریعہ قومی اور ملی زندگی میں ایک نئے عزم حیات کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ''الہلال'' اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہندوستان کی قومی وملی زندگی کے لیے ایک چراغ راہ ہے۔

جرأت مندانہ صحافت کے سلسلے میں ایک بڑا نام مولانا محمد علی جوہر کا آتا ہے۔ انھوں نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو اپنا اردو اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا اور اس کے ذریعے انہوں نے انگریزوں کی پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہمدرد کے اجراء سے دو سال قبل ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء سے وہ اپنا انگریزی اخبار ''کامریڈ'' کلکتے سے جاری کر چکے تھے۔ اردو اخبار یعنی ''ہمدرد'' دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا، اور ابتداء میں یہ صرف دو صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کی چھپائی اردو ٹائپ میں ہوا کرتی تھی۔ مذکورہ اخبار کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ اس کی

اشاعت کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی لیکن بعض عملی مجبوریوں کی بنا پر اسے اپریل ۱۹۲۹ء کو بند کر دیا گیا۔ اس کے صفحہ اول پر عالم اسلام کی خبریں موجود ہوتی تھیں۔ جس کے حصول کے لئے اخبار نے اپنے نمائندوں کے علاوہ ''رائٹر'' اور ''ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا'' جیسے خبر رساں اداروں کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں۔

صحافیانہ جدوجہد میں مولانا ظفر علی خاں کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے اخبار ''زمیندار'' کے ذریعے انگریز سرکار کے خلاف زبردست قلمی جنگ لڑی۔ بالخصوص جلیاں والا باغ کے سانحے کے خلاف انھوں نے انتہائی بے باکی سے لکھا جس کے نتیجے میں انھیں نہ صرف جیل کاٹنی پڑی بلکہ لاکھوں روپیہ جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔ گورنر پنجاب مائیکل ایڈوائر جو سانحہ جلیاں والا باغ کا ایک بڑا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اس نے مولانا ظفر علی خاں کی صحافیانہ تحریروں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لے کر نکلے ہیں۔ انگریز دشمنی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی عام منصوب شروع کرنے سے پہلے ان کو گرفتار کرنا ضروری ہے''۔

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو اخبارات کو حکومت کی جانب سے مزید سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی سختیوں کا شکار مولانا ظفر علی خان بھی بنے اور انہیں ان کے آبائی وطن کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ لہٰذا ۱۹۱۵ء میں زمیندار پھر بند ہو گیا اور ۱۹۱۹ء میں جب مولانا رہا ہوئے تو یہ اخبار اپریل ۱۹۲۰ء سے دوبارہ شروع ہو گیا۔ زمیندار کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مولانا کا کلام بھی چھپتا تھا جو سیاسی اور طنزیہ نوعیت کا ہوتا تھا جس کا تفریحی صحافت اور اردو ادب دونوں میں ایک امتیازی مقام ہے۔ یوں تو مولانا سے قبل شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی نے بھی سیاست کے حوالے سے طنزیہ شاعری میں طبع آزمائی کی مگر ان دونوں کا سیاست سے کوئی گہرا تعلق نہ تھا۔

مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کا وہ دور تھا جب ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ اسی دوران پہلی جنگ عظیم، کانپور کی مسجد کا سانحہ رولٹ ایکٹ، جلیاں والا باغ کا واقعہ اور تحریک خلافت جیسے معاملات بھی اپنے زوروں پر رہے۔ مذکورہ شخصیات نہ صرف سیاست کے میدان میں اپنی خدمات انجام دے رہی تھیں بلکہ صحافت کے ذریعے بھی انگریز حکومت کی غلط پالیسیوں کا پردہ فاش کر رہی تھیں۔

اردو صحافت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اسے فروغ دینے میں صحافیوں نے جو عرق ریزی سے کام لیا ہے، وہ تاریخ میں حروفِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اردو صحافیوں نے انگریزوں کے ظلم وستم کا نہ صرف ہمت وجرأت کے ساتھ مقابلہ کیا بلکہ ہندوستانی قوم کو بیدار رکھنے میں بے انتہا مدد بھی کی۔ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد فضا میں لانے میں ''اردو صحافوں'' کی تاریخی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق اگست 1947ء تک ہندوستان میں اردو کے 548 اخبارات وجرائد شائع ہو رہے تھے۔ جب 1956 میں رجسٹرار آف نیوز پریس آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا تو ملک بھر میں شائع ہونے والے تمام اخبارات ورسائل کی تفصیلات جمع کرنے اور شائع کرنے کا کام شروع ہوا۔ چنانچہ 1957 اخبار شماری کا اولین سال تھا۔ اس رپورٹ کے مطابق 1957 میں اردو کے اخباروں کی کل تعداد 513 تھی۔ اس طرح 1983 میں جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے مطابق 1982 میں شائع ہونے والے اردو اخبارات کی تعداد 1330 ہے، جو 1957 کے مقابلے تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔ اس اعداد وشمار کو سامنے رکھا جائے تو پتہ چلتا کہ اردو اخبار نے ہر اعتبار سے شاندار ترقی کی ہے۔

مولانا عبدالماجد کے عہد کے اُردو اخبارات

''اودھ اخبار'' نے جو مستقل اور ہمہ گیر حیثیت اختیار کی وہ اس دور میں لکھنؤ کے کسی اوراخبار کے حصہ میں نہ آئی۔اس اخبار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد نے اپنے ایک مضمون ''اردو صحافی اور لکھنؤ'' میں لکھا ہے۔

> ''اپنے ہوش کی جب آنکھ کھلی تو یہاں کے اخباروں میں سب سے پہلا نام اودھ اخبار گہر بار کا کانوں کے راستے دماغ میں داخل ہوا۔اپنے زمانے کا واحد روز نامہ مدتوں اس شہر میں نہ کوئی اس کا حریف رہا نہ مقابل۔منشی نولکشو ار اردو کے بڑے زبردست حامی وخادم گزرے ہیں،انہی کے مطبع سے یہ نکلتا تھا۔ہر طرح کا گرم وسرد سہتا ہوا،ہر اونچ نیچ سے گزرتا ہوا۔ابھی ۱۹۴۴ء ہی میں تو بند ہوا ہے۔گویا عمر ۸۵ سال پائی۔ہندو مسلم اتحاد کا پیکر تھا اور سیکولرزم کا ڈھنڈورہ پیٹے بغیر اس کا بہترین نمونہ۔اگر کچھ رنگ جھلکتا نظر آتا تو وہ مسلمانوں ہی کے کلچر کا تھا۔''[۱]

اس دور میں لکھنو کے اخبارات کی زبان عموماً اسی اسلوب کی آئینہ دار تھی جو فسانہ عجائب کا چلا ہوا تھا۔''سحر سامری'' بھی ایک ایسا ہی اخبار تھا۔اس میں لکھنو کی خبریں زیادہ ہوتی تھیں۔اس اخبار کو واجد علی شاہ سے خاص عقیدت تھی۔

۸ ردسمبر ۱۸۵۶ء کے شمارے میں لکھنؤ میں غلے کی مہنگائی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے،اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،مقفی اور مسجع عبارت بھی نظر میں رہے۔

> ''ان دنوں غلہ کی گرانی ہے،گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔اس قدر مہنگا اناج ہے کہ آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔فاقہ کشوں کی برق آہ

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی ''اردو صحافت اور لکھنؤ'' مشمولہ ''نقوش لاہور'' اکتوبر ۱۹۵۸ء ص:۲۰۱

شرربار سے خرمن ماہ جل گیا۔ گردہ نان، خورشید لشکرِ غم کے نیچے کچل گیا۔
دفورِ غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔''[۱]

انیسویں صدی کے اودھ کے دو اور اخبار ''مخزن الاخبار'' اور ''اعجاز'' تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ سے ''ہمدم'' نکلا جس کے ایڈیٹر جالب دہلوی تھے۔ شریفانہ صحافت کے علمبردار تھے۔ اور مولانا عبدالماجد سے محبت کرنے والے۔ لکھنؤ کی ادبی اور سماجی زندگی کو متاثر کرنے میں ہمدم نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۱۹ء میں مولوی ظفر الملک علوی کی ملکیت اور انیس احمد عباسی کی ادارت میں ''حقیقت'' نکلا۔ شروع میں ہفتہ وار تھا، بعد میں روزانہ ہو گیا۔ جب کہ عبدالروف عباسی کی ادارت میں ''حق'' اور حیات اللہ انصاری کی ادارت میں ''قومی آواز'' نکلنا شروع ہوئے۔

ہفتہ وار اخبارات میں ''کارنامہ'' لکھنؤ کا قدیم ترین ہفتہ وار تھا۔ یہ ۱۸۶۵ء سے ۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔ کارنامہ کے بعد مشہور زمانہ اودھ پنچ کا نام آتا ہے۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۲ء تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا اور طنز و مزاح میں اپنے طرز کے نمونے تخلیق کرتا رہا۔ مولانا عبدالماجد نے ایک کانفرنس کے استقبالیہ خطبہ میں کہا کہ:

''اس کے ایڈیٹر سجاد حسین کاکوری کی بذلہ سنجی اور زباں دانی ایک عالم کو گرویدہ کئے ہوئے تھی۔ اور زباں دانی سے بھی بڑھ کر ان کی زباں آواری، کہ ہنسی ہنسی میں کسی کو چٹکی لے لی، اور کسی کے گدگدی کر دی، بلکہ زباں دارزی، بھی کہ جیسے اس کو انگوٹھا دکھا دیا اور اس کو منہ دکھا دیا۔ اور جو بھی لارڈ کرزن کے سے دبدبہ والے اور طنطنہ والے بڑے لاٹ صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی تو بھری محفل میں ان کی کرکری کر دی'' [۲]

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی ''اردو صحافت اور لکھنؤ''، مشمولہ ''نقوش لاہور'' اکتوبر ۱۹۵۸ء ص:۲۰۱

[۲] مولانا عبدالماجد دریابادی، لکھنو کی اردو صحافت کی تاریخ، مشمولہ ماہنامہ نیا دور نومبر ۲۰۰۲ء ص:۸

ریاض خیرآبادی کا ہفت روزہ ''ریاض الاخبار'' طنزیہ ومزاحیہ اسلوب کے بنا پر خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ہفت روزہ اخباروں میں عبدالشکور کا ''النجم'' مرزا محمد ہادی رسوا کا ''الحکم''، محمود علی فلک کا ''رفیق ہند'' اور آفتاب، سرفراز، پیام اسلام، ندائے ملت، عزائم اور ہندوستانی بھی قابل ذکر اخبارات میں سے ہیں۔ جب کہ ماہناموں کا ذکر عبد الماجد کی زبانی سنتے چلئے۔

> ''اب کچھ ماہناموں کے نام بھی آپ کو سناؤں، ایک شرر مرحوم کا مشہور معروف ''دلگداز'' اور دوسرا انہیں کا مشہور ''مورخ'' ایک تیسرا خواجہ غلام الثقلین کا بلند پایہ ''عصر جدید'' اور ماہناموں ہی کے سلسلے میں ظفر الملک علوی کے الناظر اور نوبت رائے نظر کے ''خدنگ نظر'' اور پیارے لال شاکر میسح کے العصر اور قاضی تلمذ حسین کے لحیم وشحیم ''لسان العصر، چکبست کے ''صبح امید'' نیاز فتح پوری کے ''نگار'' اور عبدالوالی کے ''معلومات، کو شعری اور ادبی پرچوں میں منشی نثار حسین کے ''پیار یار'' شرر کے رسالہ ''سنج سخن'' اور علی محسن ابر کے ''معیار'' کو تاریخ صحافت سے کوئی کیونکر محو کرسکتا ہے۔ یہ سارے پودے اسی چمن (لکھنؤ) سے اُگے اور اپنے اپنے وقت میں پوری بہار دکھا گئے۔''[۱]

بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستان میں اردو صحافت نے تحریک آزادی کے قافلہ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ یہ دور صحافت کا سنہری دور تھا۔ حسرت موہانی کا رسالہ ''اردو معلی'' مولانا ابوالکلام آزاد کا ''لسان الصدق'' بعدازاں ہفتہ وار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' مولوی مجید حسن کا ''اخبار مدینہ'' ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' مولانا محمد علی کا ''ہمدرد'' وغیرہ نے مل کر اردو صحافت کو انگریزوں کے خلاف شمشیر عریاں کر دیا تھا۔ چراغ سے چراغ جلتے رہے اور اردو صحافت کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں بیسویں صدی کے اخبارات کی

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی، لکھنؤ کی اردو صحافت کی تاریخ، مشمولہ ماہنامہ نیا دور نومبر ۲۰۰۲ء، ص:۹

تعداد گنوانا مقصود نہیں بلکہ ایسے اخبارات کی نشاندہی کرنا تھا جنہوں نے تاریخ صحافت اردو پر اپنے گہرے نقش ثبت کئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو ظفر علی خاں کے ساتھ کم اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ایک عرصہ تک کام کرنے اور مکاتبت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس لیے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے بے مثال بے باکی اور مستقبل سے بے خوفی کی روایات اصلاً محمد علی جوہر اور ان کے ہمزاد ''کامریڈ'' سے ورثے میں پائی تھیں۔ وہی محمد علی جن کے بارے میں ویلز نے کہا تھا کہ انہوں نے برک کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔

مولانا عبدالماجد کی صحافتی زندگی کی شروعات

عبدالماجد دریابادی کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۰۴ء سے اودھ اخبار کے ایک مراسلہ سے ہوا جب کہ وہ صرف بارہ برس کے تھے۔ اس کے بعد اردو کے تقریباً ایک درجن سے زیادہ روزناموں ہفتہ وار اخبارات اور ماہانہ رسائل میں ان کا قلم کچھ نہ کچھ گوہر باری کرتا رہا۔ جوں جوں ان کے قلم میں قوت وتوانائی آتی گئی، ان کی تحریروں کی اشاعت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ چنانچہ ان کے علمی، ادبی مذہبی مضامین ضیاء الاسلام، وکیل، العصر، صبح امید، حقیقت، الناظر، معارف، ہمدم اور ہمدرد وغیرہ میں شائع ہونے لگے اس دور میں عبدالماجد نے اپنے قلم کو محض اردو مضمون نگاری ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ انگریزی میں بھی مضامین اور مراسلے لکھنے لگے۔ ایسے اخبارات ورسائل کی فہرست یہ ہے۔

انڈین ڈیلی ٹیلی گراف (لکھنؤ) ایڈوکیٹ (لکھنؤ) نیچر (لندن) سیٹر ڈے ریویو (لندن) ایسٹ اینڈ ویسٹ (بمبئی) تھیاسوفسٹ (مدراس) ماڈرن ریویو (کلکتہ) ریویو (مدراس) وغیرہ

''ضیاء الاسلام'' اور ''وکیل'' امرت سے کے دو مشہور اخبار تھے۔ عبدالماجد مختلف موضوعات پر مضمون بھیجنے لگے اور وہ شائع بھی ہونے لگے۔ وکیل نے ان کے دو مضامین '' محمود غزنوی'' اور غذائے انسانی'' کتابی شکل میں الگ الگ شائع بھی کیں۔ مولانا کو ایام شباب میں ادب کے ساتھ فلسفے سے بھی خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہ ان کے الحاد کا دور تھا۔ انہوں نے مغربی فلسفیوں اور ان کے فلسفے پر علامہ شبلیؒ کی مشہور کتاب ''الکلام'' کی تنقید میں ''طالب علم'' کے نام سے لکھنؤ کے مشہور ماہنامہ ''الناظر' میں ۶، ۷ قسطوں میں مضمون لکھا۔ ان مضامین کی خاص شہرت ہوئی۔ کیونکہ یہ تنقید شبلی ہی کے انداز میں مناظرانہ ومجادلانہ انداز کے بجائے خالص علمی وادبی تھا۔ الناظر میں کئی سالوں تک مضامین اور کتابوں پر تبصرہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں عبدالماجد نے اس پرچے میں ''فیہ مافیہ'' کے زیر عنوان شذرات لکھنا شروع کئے۔ ۱۹۲۴ء تک جاری رہے۔ یہ شذرات عبدالماجد نے اپنے نام سے لکھنے کے بجائے ایک قلمی نام ''چلبی'' کے نام سے لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ الندوہ، ادیب اور العصر میں بھی فلسفیانہ اور ادبی مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۱۶ء میں روزنامہ ''ہمدم'' مشہور صحافی سید جالب دہلوی کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلا اور ایک عرصہ تک بڑی آب وتاب سے نکلتا رہا۔ اس وقت تک مولانا عبدالماجد کی شہرت بحیثیت صحافی اس قدر ہوگئی تھی کہ ایڈیٹر ہمدم نے اخبار کی پہلی ہی اشاعت کے لیے ان سے ایک طویل مضمون مانگا۔ اور مولانا نے اسے لکھ بھی دیا۔ اس کے بعد کئی چھوٹے بڑے مضمون اس میں شائع ہوتے رہے۔

اسی سال ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مولانا شبلی کی یاد میں ماہ نامہ ''معارف'' شائع ہونا شروع ہوا۔ مولانا عبدالماجد اس میں بعنوان ''اخبار علمیہ'' کثرت سے نوٹ اور تبصرہ لکھتے رہے۔ اور انگریزی کے بعض مضامین کے ترجمے بھی کرتے رہے۔ معارف کے مدیر مولانا سید سلیمان ندوی یورپ اور حجاز کے سفر پر تھے تو معارف کے

ایڈیٹوریل نوٹ مولانا عبدالماجد ہی لکھتے رہے۔

اردو صحافت میں سب سے پہلے ۱۹۱۹ء کے قریب عبدالماجد نے ''معارف'' میں مستقل شذرہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان شذرات کے موضوعات ادبی و علمی بھی ہوتے تھے اور سیاسی اور سماجی بھی۔ یہ شذرات ان کی ''سچی باتیں'' کے جو سچ، صدق اور صدق جدید کا مستقل کالم ہوا کرتا تھا اور جنہیں ہندو پاک کے پیشتر اخبارات اور رسائل نقل کرتے تھے۔ پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں بھی وہی حکمت، مغرب کے مقابلے میں اعتماد نکتہ آفرینی اور عبرت آگہی ہوتی تھی جو سچی باتوں کا طرہ امتیاز تھا۔ سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی سطح پر ہونے والے واقعات ان شذرات کے لیے غذا مہیا کرتے تھے۔

اس اثناء میں مولانا محمد علی جوہر کا اخبار ''ہمدرد'' دہلی سے نکلنا شروع ہوا۔ مولانا محمد علی کے اصرار پر عبدالماجد نے اس کے انتظامی امور میں بھی حصہ لینا شروع کیا اور جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی اپنے علاج کی غرض سے یورپ گئے تو اخبار کی ادارت اور انتظامی امور کی نگرانی مکمل مولانا عبدالماجد کے سپرد کر گئے۔ اس دور میں مولانا کے قلم سے کئی مضامین ہمدرد میں شائع ہوتے رہے جس میں ''شیر کی گرج'' اور نہرو رپوٹ'' خاص طور پر مقبول ہوئے۔

اخبار ''سچ'' کی اجرائی

الناظر کے ایڈیٹر ظفر الملک علوی کے ساتھ علمی تعاون کی وجہ سے مولانا عبدالماجد کی دوستی کا رشتہ مضبوط ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالماجد نے اپنی آپ بیتی میں مضمون نگاری و صحافت کے نام سے تین ابواب قائم کر کے مفصل تحریر کیا ہے۔ وہ ہفتہ وار ''سچ'' کے اجرائے کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔

''اخیر ۱۹۲۴ء تھا کہ دفتر الناظر میں ہم چار آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مَیں، دوسرے ظفر الملک علوی، تیسرے مولانا عبدالرحمن ندوی نگرامی، اور چوتھے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی۔ چاروں میں اس وقت تک رشتہ اخلاص و یگانگت قائم تھا۔ اور سیاسی اور دینی ہم خیالی بھی بڑی حد تک تھی اور رائے یہ قرار پائی کہ اپنے خصوصی دینی، اصلاحی اور اجتماعی خیالات کے نشر و اشاعت کے لیے مستقل ہفتہ وار سچ کے نام سے نکالا جائے۔ مینیجر ظفر الملک صاحب علوی ہوں اور ایڈیٹری میں بھی پرچہ پر نام انہیں کا رہے، لیکن عملاً ادارت نگرانی اور دریابادی کے ہاتھ میں رہے''۔[1]

جنوری ۱۹۲۵ء میں ''سچ'' کا پہلا شمارہ منصۂ شہود پر آیا۔ ابتداء میں اس پرچے کے ایڈیٹر ظفر الملک علوی تھے اور عبدلماجد شریک ادارت تھے۔ لیکن اگست ۱۹۲۵ء میں عبدالماجد اس کے ایڈیٹر بن گئے اور ظفر الملک اس کے مینیجر۔ گویا سچ پہلا اخبار تھا جس کے مولانا عبدالماجد باقاعدہ ایڈیٹر تھے۔ سچ کی پیشانی پر ایک فارسی شعر مستقل درج ہوتا تھا۔

راستی موجبِ رضائے خداست　　　کس نہ یدم کہ گم شد از رہِ راست
(سعدیؒ)

اس اخبار کا نام ''سچ' عبدالماجد اور ان کے دوستوں کے ذہن میں کیسے آیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبدالقدوس ہاشمی لکھتے ہیں۔

''ابتداء میں سچ کی ادارت میں عبدالرحمن ندوی نگرامی بھی شامل تھے۔ مولانا نگرامی کے ذہن میں اخبار سچ نکالنے کا خیال اس طرح پیدا ہوا تھا کہ انگریزی میں ایک ہفتہ وار اخبار ''ٹروتھ'' کے نام سے نکلتا ہے۔ مَیں جس زمانے میں شہر گیا کے رسالے ندیم کا ایڈیٹر تھا تو بڑی پابندی

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، ص: ۲۱۹

کے ساتھ یہ اخبار لندن سے منگواتا اور پڑھتا تھا۔ اخبار ''ٹروتھ'' ویسے تو بظاہر ایک مجموعہ افکار بلکہ بڑی حد تک تحقیقی مضامین کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ بگڑی ہوئی عیسائی کا منادی ہے۔ اس اخبار کو دیکھ کر خیال ان کے ذہن میں آیا کہ اس طرح کا ہفتہ وار اردو میں شائع کیا جائے۔''[۱]

اخبار ''سچ'' کی خصوصیات

اس اخبار کی زبان بہت ہی سہل اور دل نشین ہوتی تھی۔ مولانا عبدالماجد ۱۹۲۹ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے اور پورا سفر نامہ ''سچ' میں قسط وار شائع کیا جو بعد ازاں کتابی شکل میں سفر حجاز کے نام سے شائع بھی ہوا۔ اس کے مطالعہ سے ان کی انشاء پردازی کا اصل رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حج کے متعلق دینی معلومات کے ساتھ ساتھ ادب وانشاء کا دل کش گلدستہ بھی ہے۔

اخبار ''سچ'' کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اصلاح معاشرہ، ردِ بدعات، تجدّد اور ترقی پسندی کی مخالفت اس کے چند خاص موضوعات تھے۔ فتنۂ انکار حدیث کا مقابلہ اس نے مدتوں کیا۔ ۳۲۔۱۹۳۱ء میں اس نے نیاز فتح پوری کے الحاد اور فتنہ نگار کا مقابلہ ہر محاذ پر کیا۔ عظیم بیگ چغتائی کی کتابوں اور ترقی پسند تحریک کے افسانوں کے مجموعہ ''انگارے'' کے خلاف سخت آواز اٹھائی۔ ساتھ ہی نظریہ خلافت کی تبلیغ بھی ''سچ' کا مشن رہا۔ اور آزادی ہند کی تحریک بھی۔

ہفتہ وار ''سچ' کا مقصود اصلی صحیح عقائد کی ترویج، اسلامی تعلیمات کی تبلیغ، بدعات و رسومات کا خاتمہ، معاشرہ کی اصلاح، خلافت کے احیاء کی کوشش، ملک کی آزادی میں حصہ

[۱] عبدالقدوسی ہاشمی، مشمولہ سچی باتیں، ص:ص

لینا، باطل نظریات کی بیخ کنی فرنگی تمدن اور مغربی سیلاب کو روکنا تھا، ''سچ'' ایک ہفتہ وار اخبار ہی نہیں بلکہ ایک اصلاحی صحیفہ کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اس کی خدمات کا اعتراف تمام اہل قلم نے کیا۔ صباح الدین عمر لکھتے ہیں۔

> ''سچ قوم پرور اخبار تھا اس نے تحریک آزادی کی ہمیشہ حمایت کی اور یہ بتانے کی برابر کوشش کرتا رہا کہ مسلمانوں کا مسلک اپنے وطن سے محبت اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہونا ہے۔ اسی کے ساتھ سچ کے صفحات پر اسلام کے خلاف حملوں کا جواب بھی ہوتا تھا اور مغربی تہذیب کے مضر اثرات اور رجحانات سے بچنے کی بھی مسلمانوں کو تلقین کی جاتی تھی۔ اس میں بعض اوقات اتنا گہرا اور شدید طنز ہوتا تھا کہ مخالف تلملا اٹھتا تھا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں اس کے بعض مضامین کی بنا پر انگریزی حکومت نے سچ سے ضمانت طلب کر لی اور چونکہ ضمانت داخل نہیں کی گئی اس لیے اخبار بند کر دیا گیا۔ البتہ ۱۹۳۰ء کے آخر میں اسے پھر نکالا گیا، لیکن ۱۹۳۲ء میں بعض وجہوں سے اسے بالکل بند کر دیا گیا۔''[۱]

اخبار ''صدق،'' اور ''صدق جدید'' کی اجرائی

۱۹۳۲ء میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ وتفسیر کے کام کا آغاز کیا۔ اس لیے اخبار ''سچ'' کو وقتی طور پر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء سے یہی اخبار ''صدق'' کے نام سے لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا۔ پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۵ء میں منظر عام پر آیا۔ شروع میں عبدالرؤف عباسی اس کے مینیجر تھے اور مولانا عبدالماجد بدستور اس کے ایڈیٹر رہے۔ بعد میں مولانا کے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم حافظ عبدالقوی بی اے اس کے مستقل مینیجر بن گئے تھے۔ اس کے بارے میں

[۱] صباح الدین عمر، اردو کا صاحب طرز صحافی ''مشمولہ نیا دور اپریل، مئی ۱۹۷۸ء ص: ۵۶، ۵۷

وہ خود رقمطراز ہیں۔

> ''شروع شروع میں وہ دو روزہ تھا، بعد ازاں ہفتہ وار ہو گیا۔ اس کی سچی باتوں اور نوٹوں اور مقالات نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کرلی۔ اخبار ''سچ'' کی سابقہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے جدید ترین فتنوں کے مقابلہ میں بھی اس اخبار نے نمایاں شہرت حاصل کرلی۔ اس کے علاوہ اردو کتب اور رسائل پر اس کی بلند پایہ تنقیدات کی بھی ملک میں دھوم مچ گئی، ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کے باعث اخبار صدق بن کرنا پڑا اور چند ماہ کے تعطل کے بعد یکم دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار ''صدق جدید'' کے نام سے نکلنے لگا ہے۔''[۱]

'سچ' اور 'صدق' کی خصوصیات و خدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی نے سچ اور صدق کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ ان کے ذریعہ اسلام کی مدافعت اور تبلیغ کرتے تھے۔ لیکن ان کی انشاء پردازی کی زبردست صلاحیت اور خلاقانہ قوت کی بدولت ان کی تحریروں میں خشکی کے بجائے دلآویزی اور ایسا جمال اور ایسی تاثیر ہوتی ہے جو بہت کم اہل قلم کے حصے میں آتی ہے۔

'سچ' اور 'صدق' کے خدمات و خصوصیات کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی ہی کی زبانی سنئے۔

۱۔ واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا' کہ پہلے نفس خبر، بجنسہ نقل کردی اور پھر اس پر مختصر، جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا۔ صدق و سچ سے پہلے شاید اردو کی دنیائے صحافت کے لیے نامعلوم تھا۔

---

[۱] حکیم عبدالقوی ''عبدالماجد دریابادی'' مشمولہ نقوش شخصیات نمبر، ص: ۲۶۲

۲۔ صدق نے طنز وتعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے، لیکن اپنی والی کوشش ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر اور صرف پبلک زندگی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر۔

۳۔ مروت اور شخصی تعلقات سے یہ تو نہیں کہ سرے سے اثر قبول ہی نہیں کیا گیا، البتہ اس تاثر کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھا گیا ہے اور اسے پبلک فریفتہ احتساب پر غالب نہیں آنے دیا گیا۔

۴۔ ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل بلا کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب وتخرب کے پیش کیا اور جہاں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس سے سکوت ہی اختیار کر لیا گیا۔

۵۔ اظہار رائے اور جنبش قلم میں، یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی بھی ذات جذبات سے متاثر نہیں ہوا ہوں، جہاں کہیں بھی اس قسم کی لغزشیں ہوں، اللہ سے دعا ہے کہ اسے معاف فرمائے۔ [۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہی وہ حق پرستی اور راست گوئی کا جذبہ تھا جس نے مولانا موصوف کو بے باک کر دیا تھا۔ مولانا عبدالماجد فسق وفجور کے بدترین دشمن تھے۔ اور اس سلسلے میں ہر قابل دست اندازبات ان کی تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ اس میں وہ رعایت کسی کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ وہ بے خوفی کے ساتھ اپنے دل کی بات اور اپنا خیال پیش کر دیتے تھے۔ پاکستان میں سینما بینی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سلسلے میں ایک خبر پا کر روزانہ تماشائیوں کی تعداد اوسطاً ڈیڑھ لاکھ ہے، آپ لکھتے ہیں۔

> ''اس سینما کا جو زور ہے اس کے لحاظ سے یہ ڈیڑھ لاکھ روزانہ تماشائیوں کی تعداد پاکستان کے لیے تو زیادہ نہیں کم ہی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال اس انداز کو بنیاد قرار دے کر کاش کوئی حساب لگا کر یہ

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی ص: ۲۲۶

بھی بتادیتا کہ سال کے کتنے گھنٹے اور کتنے دن اپنی عمر عزیز کے اور اپنی دولت کا کتنا حصہ پاکستانیوں نے اس شغل پر ضائع کر دیا۔[۱]

مولانا عبدالماجد کا نظریۂ صحافت

مولانا عبدالماجد دریابادی اردو کے صف اول کے صحافی تھے وہ صحافت کے اثر ونفوذ اور اس کی قوت وتاثیر کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ وہ حق وصداقت پر مبنی صحافت کے علمبردار تھے۔ ان کا قلم صدق نگار اور ان کا اخبار صداقت شعار تھا۔ صحافت کے بارے میں ان کے مخصوص نظریات تھے جس کا اظہار انہوں نے ''صحافت کے آداب'' کے زیر عنوان (صدق جدید ۲۹ ؍ مارچ ۱۹۶۸ء) میں کیا ہے۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ مقصود خدمت دین وملت رکھئے۔ عام خدمت خلق بھی اس کے تحت آجاتی ہے۔

۲۔ پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر اکتفانہ کیجئے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھئے۔

۳۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اس کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھے۔

۴۔ خبر برائے خبر کا روزناموں میں جب بھی درجہ ہو ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزے میں اپنے تبصرے سے یا کم سے کم خبر کی سرخی ہی سے ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجئے۔

۵۔ وطن کا بڑا حق ہوتا ہے۔ البتہ مسلمان ''پرستان وطن'' نہیں ہوسکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذات حق کے لیے مخصوص ہے۔

---

[۱] ''صدق جدید'' ۲۲، جولائی ۱۹۵۷ء

۷۔ بلا وجہ معقول کسی کی دلآزاری کیا معنی؟ دل شکنی بھی گوارا نہ کیجئے۔ مروت کے بھی حدود قائم کر لیجئے ان کے آگے قدم نہ رکھیے۔

۸۔ ملک کی اکثریت کا حکومت وقت کے قانون کا ضرور لحاظ رکھیے۔ حتی الامکان راہ سلامت روی کی اختیار کیجئے لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک ہرگز نہ پہنچ جایے۔ صلح و سازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

۹۔ پبلک تنقید آزادی سے کیجئے۔ لیکن ذاتیات پر اُتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچایئے۔ کسی کے نسب، پر وطن پر شکل و صورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

۱۰۔ جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات قابل گرفت ہوتی ہے۔ اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی زد میں آسکتا ہے۔ خیال کیجئے اور ڈرتے رہیے اس وقت سے جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقت عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

مولانا کی ساری زندگی ان ہی اصول پر عمل گامزن رہی اور ان کے اخبار بھی انہی اصولوں پر قائم رہے۔ ان کے نزدیک صحافت کا سب سے بڑا مقصد خدمت دین وملت تھا۔ سچ، صدق، صدق جدید کے مشمولات اسی ایک مقصد سے پھوٹتے تھے۔ وہ لکھے ہوئے ایک ایک لفظ اور حرف کے لیے خود کو مسئول سمجھتے تھے۔

''صدق اور صدق جدید'' کی پیشانی پر قرآن کے آیت درج ہوتی تھی۔ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ (سورۂ زمر)
ترجمہ ''اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور خود بھی اس کو سچ جانا تو یہی لوگ تو پرہیزگار ہیں۔''

مولانا عبدالماجد نے اس آیت کو محض یوں ہی درج نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح ''سچ'' کی پیشانی پر درج شعر ماجد کی صحافتی تحریروں کا منشور تھا۔ اسی طرح یہ قرآنی آیت بھی مولانا عبدالماجد کا نصب العین تھا۔ اسی طرح سچ کا نام محض لندن کے Truth کی نقالی میں نہیں رکھ لیا تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے ان کا صداقت شعار تصورِ صحافت کارفرما تھا۔

عبدالماجد دریابادی کی ساری صحافتی زندگی متذکرہ بالا آیت کے اطراف گھومتی ہے۔ صداقت شعاری وصدق نگاری ان کی زندگی کا طرہ امتیاز تھا۔ چنانچہ تقسیم ملک کے فوراً بعد جب ہندوستان کے اکثریتی فرقے کے بعض تنگ نظر اذہان میں احساس برتری پیدا ہو گیا اور یہاں کے ایوان اقتدار میں شامل فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کو دھمکانے لگے تو اس کے مقابل آواز اٹھانے والوں میں عبدالماجد سابقون الاولون کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر جب ہندوستان کے طول وعرض میں بولی جانے والی اردو زبان کو ملک سے نکال دیا گیا اور حتی کہ اردو بولنے والے ہندوؤں کا شمار بھی ہندی بولنے والوں میں کیا جانے لگا تو اس پر بھی عبدالماجد وقتاً فوقتاً'' حکومت کو جھنجھوڑتے رہے۔ کہیں وہ آنند نرائن ملا جیسے لوگوں کی صاف گوئی اور ان کے احتجاج کو اپنے پرچے میں جگہ دیتے رہے اور بتاتے رہے کہ مردم شماری کرنے والوں نے ان کا نام ہندی بولنے والوں میں محض اس لیے لکھ دیا تھا کہ وہ ہندو ہیں اور انہیں ہندی کٹوا کر مادری زبان اردو لکھوانا پڑی تھی اور کہیں وہ متعصب ہندو اہل قلم اور اہل سیاست کے اس دعوے کی مختلف مثالوں سے نفی کرتے رہے کہ مسلمان متعصب قوم ہیں کیوں کہ انہوں نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزارنے کے باوجود اپنے اوپر ہندیت کا شائبہ تک نہیں پڑنے دیا۔ اس ضمن میں عبدالماجد ادب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی مثالیں پیش کرتے رہے مثلاً ''گل بکاولی''، ''اندرسبھا'' اور ''فسانہ عجائب'' وغیرہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان عناصر کے والہ وشیدا ہیں۔

فسانہ عجائب سے ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد جس میں سطریں کی سطریں ہندی

اور سنسکرت الفاظ سے پُر ہیں۔اور جیوتش اور نجوم کی اصطلاحات مثلاً ''پوتھی، 'چندریاں' ریگ تیگ، ''' پرتھوی میں دھوم مچے'' '''سنیچر پاؤل پڑے گا'' کے حوالے سے مولانا عبد الماجد تبصرہ کرتے ہیں۔

''ہند کا مسلم تمدن اور مسلم ادب کس حد تک ہندو عقائد ہندو رسوم، ہندو شعائر سے متاثر ہو چکا ہے، یہ سب اگر اس کا کھلا ثبوت نہیں تو کیا؟ یہ ہونا چاہیئے تھا یا نہیں اور اسلامی نقطہ نظر سے یہ جائز کہاں تک تھا۔ یہ سارے سوالات الگ ہیں، یہاں ذکر نفس واقعہ کا ہے'' [۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی صحافتی زندگی میں کئی علمی و ادبی معرکے بھی سر کیے ہیں۔ان کے تذکرہ کے بغیر علمی و ادبی معرکوں کی کوئی بھی تاریخ نامکمل رہے گی۔ان کی ادبی و علمی مباحثوں اور مناقشوں کے ضمن میں مولانا کے طریقہ کار کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود عبدالماجد نے ایک موقع پر اپنے حریف کو (جو ان کے نزدیک ملت کا مجرم ہے) پچھاڑنے کے اپنے طریقہ کار کی وضاحت کی ہے۔

''میری صحافتی Strategy (تدبیر جنگ) کو بھی اس سلسلے میں یاد رکھ لیا جائے۔ میں ملت کے مجرم کو زیادہ سے زیادہ Isolates (یکہ و تنہا) کر دینا چاہتا ہوں۔صرف مشتبہ یا خفیف قصور والوں کو اس سے الگ رکھنا چاہتا ہوں کہ مجرموں کو دوسروں کی آڑ اور سہارا لینے کا موقع کم سے کم مل سکے۔باقی تمام کمزوریوں سے بلندتر رہنے کا دعویٰ اپنے حق میں کیسے کر سکتا ہوں''[۲]

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی، از مذہب من گیر و مسلمان گلہ دارد، مشمولہ صدق جدید ۶/ جولائی ۱۹۶۵ء

[۲] احمد جمال پاشاہ، صاحبِ صدق کا نثری اسلوب اور طنز'' مشمولہ فروغ اردو لکھنؤ اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۱۷۵،۱۷۶

علمی وادبی مباحثوں اور معرکوں کے سلسلے میں مولانا کا یہ کہنا کہ وہ حریف کا بالکل یکہ تنہا کر دینا چاہتے ہیں، ایک کلیدی جملہ ہے۔ اس سے ان کے طریقہ کار کے سائنٹفک ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ عظیم بیگ چغتائی کی قابل اعتراض تصانیف پر شور خیزی کا معاملہ ہو یا ''انگارے'' کی فحاشی اور سوقیت کے سلسلے میں شدید مخالفت کا ''محشر خیال'' کی لبرل ازم کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کا معاملہ ہو یا سینٹ گیبریل میگزین میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت کی شان میں گستاخی پر مبنی مواد کی مذمت کا، جوزف ہیل کی ''عربوں کا تمدن'' جیسی کتاب کے قابل اعتراض ہونے کا مسئلہ ہو یا یگانہ چنگیزی کے خلاف محاذ آرائی کا'' نیاز کے خلاف صف بندی کا معاملہ ہو یا شہد احمد دہلوی کو ''اُمہات الامہ'' کو دوبارہ شائع کرنے سے باز رکھنے کا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ہر جگہ وہی حربہ استعمال کیا ہے جسے ''تنہا کردن'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام معرکوں اور مجادلوں میں ماجد کی کامیابی کا سبب یہی تھا کہ وہ ان مسائل پر اس تفصیل سے زور قلم کی اس شدت سے لکھتے تھے کہ بالآخر وہ مسئلہ عوامی بن جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس سیلاب کو روکنا آسان نہ ہوتا۔

ایک سچے اور دردمند عالم دین ہونے کی حیثیت سے مولانا عبدالماجد ایسے قلمی جہاد کرنا اور تسامحات کے خلاف لکھنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے لیکن اس سے یہ ہرگز سمجھنا نہیں چاہیے کہ ان میں رواداری کا فقدان تھا یا وہ مذہب اسلام کے علاوہ باقی مذاہب مثلاً ہندومت یا اس کی مذہبی کتاب کے خلاف اہانت پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بمبئی میں جب ایک موقع پر ہندو پریس میں غلط یا صحیح یہ خبر شائع ہوئی کہ وہاں کے کسی مسلمان نے گیتا کی توہین کی ہے تو عبدالماجد کا ردعمل یوں تھا۔

> ''گیتا کی توہین وتذلیل کوئی دیوانہ ہی مسلمان کر سکتا ہے۔ میں نے گیتا جو دراصل سری کرشن جی کے خطبات جنگ کا مجموعہ ہے، انگریزی اور

اردو ترجموں کی مدد سے پڑھی ہے اور پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ معرفت کی ایک اعلیٰ کتاب ہے اور جہاں تک بندہ کی فرض شناسی اور جہاد و قتال کی تعلیم کا تعلق ہے اس کی تعلیم قرآن مجید سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہے۔"[۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی کے تمام معرکے اور علمی مباحث صحافت کے باب میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ احمد جمال باشاہ مولانا کے "صدق" اخبار کا "اودھ پنچ" سے تقابل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"سچ" اور پھر "صدق" کا ایک دلچسپ پہلو صاحب صدق کے ادبی معرکے ہیں۔ نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی سے لے کر حیات اللہ انصاری تک ان کے یہ معرکے ہماری ادبی، تہذیبی، مذہبی ثقافتی اور صحافتی زندگی کا ایک بہتر ہی باغ و بہار ہیں۔ جب بھی اردو ادب کے ادبی معرکوں کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو یقین ہے کہ اس کا یہ باب اس اعتبار سے ضرور عجیب وغریب ہوگا کہ معرکے کوئی بھی ہو۔ مگر آخر میں میدان ان ہی کے سر رہا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ صدق میں ادبی معرکے کی سج دھج اودھ پنچ سے کم نہیں ہوتی اودھ پنچ کے یہاں توازن کا اہتمام ذرا کم ہی نظر آتا ہے مگر یہ اس کے تمام فنی آداب برتتے ہیں اور کبھی جادہ اعتدال سے نہیں ہٹتے۔ اودھ پنچ کا پورا توپ خانہ میدان سر کرنے کے لیے اُتر پڑتا تھا مگر صاحب صدق خود توپ خانے کی کمان ایک ماہر جنرل کی طرح سنبھال لیتے ہیں اور منزلیں مارنے میں عجلت سے کام لینے کے بجائے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ ان کا حملہ ہمیشہ غیر متوقع اور فوری ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ حریف کوزک

[۱] صدق جدید ۱۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء ص:۲

دینے کے لیے ان کی محض ایک پھبتی کافی ہو جاتی ہے۔"[1]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "صدق" کے اوراق میں اکثر اس مظلوم کی بے بسی کو زبان دی۔ ان کی تحریروں میں بے لاگ سچی تنقیدیں ملتی ہیں جن میں لگاوٹ کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہوتا۔ مولانا عبدالماجد ایسے شخص تھے جو اپنوں، بیگانوں سب کے لیے دل میں جگہ رکھتے تھے۔ غیر مسلموں کی بھی فلاح چاہتے تھے۔ اپنی صحافت کی پالیسی کے تعلق سے وہ خود رقمطراز ہیں۔

> "صدق کا مسلک ومزاج اچھا ہے یا برا جیسا کچھ بھی ہے واضح اور ظاہر ہے اور حیرت ہے کہ کوئی شخص اس کے چند پرچے پڑھے اور غلط فہمی میں مبتلا رہے وہ سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں ہے ہی نہیں۔ اصلاً ایک دینی، اصلاحی دعوت ہے۔ پھر اس کا ایک مخصوص علمی وادبی کردار معیار ہے اور اس کا خاص حصہ کتابوں کے نقد ونظر کے لیے وقف رہتا ہے۔ ان سب کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے تو وہ سیاسی رائے زنی بھی کر دیتا ہے وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی آئینی قانونی، جغرافیائی طور پر وابستہ ہے۔
>
> اخلاقیات کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میدان میں آ کر صدق کا تعلق ساری دنیا خصوصاً اسلامی دنیا سے قائم ہو جاتا ہے۔ اور وہ فسق والحاد پر نکتہ چینی اپنی بساط کے موافق دنیا بھر پر کیا کرتا ہے۔ صدق کے پاس اس بدقسمتی کا کیا علاج ہے کہ پاکستان پر اس کے شذرت کثرت سے نقل کرتا رہتا ہے۔ صدق کے فرد جرم میں ذکر تلخی وتنگ نظری کا آیا ہے۔ تلخی سے اشارہ اگر دعوت صدق کی جانب ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تو

[1] احمد جمال پاشاہ، "صاحب صدق کا نثری اسلوب اور طنز"، مشمولہ فروغ اردو لکھنؤ اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۱۷۵، ۱۷۶

> گزیرا اور کوئی دعوت آج تک ایسی نہیں ہوئی جو کسی نہ کسی طبقہ کو تلخ نہ محسوس ہوئی ہو۔ رہا دوسرا سوال تنگ نظری کا۔ اس سے اگر متعصب مراد ہے تو بحمد للہ شریف ہندوؤں کی داد و تحسین میں تو صدق نے آج تک بخل سے کام نہیں لیا ہے۔"[1]

یہ اقتباس اس بات کا بین اور روشن ثبوت ہے کہ صاحب صدق حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی ایک اصلاحی مزاج کے صحافت نگار تھے، اور محض سنسنی خیزی اور ہنگامہ آرائی ان کے اخبار یا ان کی صحافت کا مقصد اور منشاء نہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہل ہند اور تمام انسانی برادری کی اصلاح و بہودی کے پیش نظر اپنا صحافتی زور قلم صرف کیا، اور صحافت کی تاریخ میں وہ اصلاحی اور تعمیری صحافت کے علمبردار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

تعمیری و اصلاحی اور اسلامی صحافت کی جب بھی تاریخ رقم کی جائے گی مولانا عبد الماجد دریابادی کا نام خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ ان کی تحریر جانب داری اور تعصبیت سے پاک وصاف اور حق وصداقت کی علمبردار ہوتی تھی۔ یہاں پر ان کے اخبار سے "روپیہ کا حقیقی مصرف" کے نام سے ایک طویل اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس میں ان کے صحافت کا رنگ صاف کھول کر نظر آتا ہے۔

> اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۸ (البقرۃ)
>
> ترجمہ: "شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمہیں اپنی طرف سے بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور اللہ کشائش والا علم والا ہے۔"

---

[1] صدق جدید ۸؍ اگست ۱۹۵۸ء

آیت بالا، سورۃ البقرہ میں واقع ہوئی ہے، اوپر سے مضمون یہ چلا آرہا ہے کہ مسلمانوں کو رسم ورواج کی مد میں ریاونمائش جاہ ونفس کی راہ میں خرچ کرنے سے بچنا چاہئے اور اپنی دولت اللہ کی رضاجوئی کے لیے نیک کاموں میں خرچ کرنا چاہئے اور اس خرچ کو فضول ولاحاصل سمجھنا چاہئے اس آیت میں مذکور یہ ہے کہ راہِ خدا میں کارخیر میں خرچ کرنے سے شیطان طرح طرح سے آکر روکتا ہے دل میں مفلس وتنگدست ہوجانے کے وسوسے پیدا کرتا ہے اور مال کو بچابچا کر جوڑ رکھنے کی ترغیب دیا کرتا ہے، لیکن اللہ جس کے ہاتھ میں سارے اسباب کشائش کی کنجی ہے اور جو تمام داناں سے بڑھ کر دانا ہے جس نے افلاس وامارت ناداری وخوشحالی کے قوانین ہی دوسرے رکھے ہیں وہ دوسری طرف سے اطمینان دلاتا ہے کہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے ہرگز کوئی مصیبت نہیں آجاتی بلکہ اس کے فضل وکرم ہی کا نزول ہوتا ہے۔ شیطان برابر تحریک دل میں ڈالتا رہتا ہے کہ دولت کو بڑے بڑے بنکوں میں محفوظ کردو اپنے سرمایہ سے ساہوکاری شروع کردو اپنے روپیہ کو کرایہ پر چلانا شروع کردو کہ اس سے بجائے گھٹنے کے بڑھنے لگے گا، ہر قسم کے لطف وعیش عزت ونمود کا سامان خریدیا جاسکے گا کہ یہی حاصل حیات ومقصد زندگی ہے، یہ تمام تحریکیں جس ذریعہ سے پیدا ہوتی ہیں ان کا ایک جامع نام قرآن پاک نے ''شیطان'' فرمادیا ہے۔ اب ارشاد ہو کہ آج آپ کے گردوپیش یہی صورت حال ہے یا نہیں؟ آپ کے دوستوں میں آپ کے ملنے والوں میں آپ کے جاننے والوں میں کتنے ایسے ہیں، جو آپ کو سفر حج کے لیے آمادہ کرتے ہیں؟ جو آپ کو پابندی کے ساتھ زکوۃ نکالنے کی صلاح دیتے رہتے ہیں؟ پھر جب آپ ازخود کسی نیک مقصد میں چندہ دینے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں تو کتنے ایسے ہیں جو اس سے آپ کو روکنے

کی کوشش نہیں کرتے اور قومی کارکنوں کے چندہ کھا جانے کی داستانیں سنا سنا کر آپ کو ان کے خلاف نہیں ورغلایا کرتے؟ اس کے برخلاف کس کثرت سے ہر اخبار ہر انجمن ہر لکچرار کے ذریعہ سے آج یہ شیطانی تحریک آپ کے دل میں ڈالی جارہی ہے کہ روپیہ کو سودی کاروبار میں لگاؤ، بیمہ کمپنیاں قائم کرو، ساہوکاری اور مہاجنی کا پیشہ اختیار کرو اور اپنا اعتماد اپنے پیدا کرنے والے اور ہر شئے پر قدرت رکھنے والے سے ہٹا کر بینک کے مینیجروں اور بیمہ کمپنیوں کے ڈائرکٹروں پر قائم کرو اللہ پر اعتماد و توکل کا نام زبان پر ترک دنیا کی تعلیم دینا ہے، رہبانیت ہے جمود و تاریک خیالی ہے لیکن وہی توکل و اعتماد اگر بجائے دولت آفریں کے دولت پر قائم کیجئے، گورنمنٹ کے نوٹوں پر ڈاک خانہ کے تمسکات پر بینک کے حصوں پر جتنا بھی چاہے آنکھ بند کر کے قائم کیجئے عین دانشمندی روشن خیالی ہے، ضروریات زمانہ کی نبض شناسی ہے، امت کی مخلصانہ خدمت گزاری ہے اور قوم کی مصلحانہ خیراندیشی ہے۔ [۱]

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کے اخبارات سے کچھ اور شذرات کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

''اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی سرا میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعث توہین۔ لیکن کسی ''ہوٹل'' میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ ''سرا'' مشرقی ہے، دیسی ہے اور ''ہوٹل'' مغربی ہے۔ انگریزی، ولایتی، کوئی اگر یہ کہہ دے کہ سرا کے فلاں ''بھٹیارے'' سے آپ سے یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں۔ لیکن فلاں ہوٹل کے ''مینیجر'' سے

[۱] ہفتہ وار ''صدق جدید'' ۸/ اگست ۱۹۵۰ء

آپ سے بڑا ربط وضبط ہے، اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں حالانکہ سرا کے ''بٹیارے'' اور ہوٹل کے ''مینیجر'' کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟''[۱]

''سازندہ کا اعزاز'' (وایلن بجانے والے مشہور امریکی فن کار یہودی منوہن کو ملکہ برطانیہ کی طرف سے کے۔بی۔ای کا خطاب دیے جانے پر)

''جو کہیں آپ کسی کی زبان سے بہ طور افواہ بھی یہ سن لیں کہ کسی طبلچی، کسی سارنگیے، کسی پکھاوجی کو فلاں شہنشاہ دہلی نے پنج ہزاری یا ہفت ہزاری، منصب سے سرفراز کر دیا تھا۔ یا فلاں شاہ اودھ نے اسے اپنے دربار کے امرا میں شامل کر لیا تھا تو شرم سے آپ کی آنکھیں نیچی ہو جائیں اور عجب نہیں کہ تحقیر و تمسخر کے ساتھ آپ خبر پر ہنس بھی پڑیں لیکن یہی خبر جب برطانیہ سے فرانس سے امریکہ سے آتی ہے تو اسے آپ احترام کے کانوں سے سنتے ہیں اور آپ کا دل و دماغ اسے آرٹ نوازی، فن کی قدردانی اور فن کار کی حوصلہ افزائی قرار دیتا ہے۔

سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہیے''[۲]

''داغ اپنی جمائے جاتا ہے'' (لکھنؤ میں پتنگ بازی کے مقابلے پر تبصرے کرتے ہوئے)

''شاباش لکھنؤ! اور زندہ باد ملت اسلامیہ! ایسے میدانوں کے مرد میدان، سوا ''خیر اُمت'' کے اور کہاں مل سکتے ہیں۔ ہوش رُبا گرانی نے مزہ نیم فاقہ کشی کا چکھا دیا ہو۔ خطرۂ قحط کے بگل پر بگل بجتے جا رہے ہوں۔ بے فکروں کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور نہ چھوٹنے پائے۔

---

[۱] ہفتہ وار ''سچ'' ۱۹۳۱ء
[۲] صدق جدید ۱۷/دسمبر ۱۹۶۵ء

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا
اور داغ کو یہ موھن کہ آئے کہ آئے کوئی خوب رو پسند" [۱]

اگر کوئی مسلمان رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ پائے اور اس کی برکتوں ورحمتوں سے فیضیاب نہ ہوتو وہ بدنصیب سمجھا جاتا ہے۔ مولانا اس بات کو کچھ اس طرح منطقی انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری اپنے دامن میں جھانکنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسے اپنی کوتاہیوں کو احساس دامن گیر ہو جاتا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"موسم گل شباب پر ہے، آپ وسط چمن میں ٹہل رہے ہیں، پر آپ خوشبو کو روکنے کے لیے اپنی ناک پر مضبوط غلاف چڑھائے ہوئے ہیں! اشرفیاں لٹ رہی ہیں اور آپ کی گود میں آ آ کر گر رہی ہیں۔ پر آپ انہیں ہاتھ سے جھٹک کر اپنی کوڑیوں کے کھیلنے میں لگے ہوئے ہیں! پختہ، وسیع و ہموار سڑک روشنی سے پڑی جگمگا رہی ہے، پر آپ تنگ و تاریک، ناہموار و پُرخار پگڈنڈی پر چل کر اپنے پیروں کو ہلکان کر رہے ہیں! رمضان کا ماہ مبارک اپنی تمام لذتوں اور راحتوں، مسرتوں اور فرحتوں کی دعوت آپ کو دے رہا ہے، جنت کی نعمتیں خود اپنے کو آپ پر پیش کر رہی ہیں، لطافتیں اور طہارت خود آپ سے ہم آغوش ہونے کو بڑھ رہی ہیں، پر آپ ہیں کہ اپنی ملازمت اور اپنی تجارت، اپنی دکانداری اور اپنی ٹھیکہ داری، اپنی وکالت اور اپنی طبابت، اپنی نثاری اور اپنی شاعری، اپنی ماسٹری اور اپنی انسپکٹری، اپنی مینجری اور اپنی ایڈیٹری، اپنی ججی، اور اپنی بیرسٹری، اپنی تحصیلداری، اور اپنی ڈپٹی کلکٹری کی دھن میں ایسے مست و مدہوش ہو رہے ہیں کہ ناک رکھتے ہیں، مگر خوشبو کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے،

[۱] صدق جدید ۱۷ر دسمبر ۱۹۶۵ء

آنکھ رکھتے ہیں مگر روشنی سے محرومی اختیار کرلی ہے، بیمار ہیں مگر دوا نہ کرنے کی قسم کھالی ہے! نادانی، بے عقلی، ناعاقبت اندیشی، بدقسمتی، حرمان نصیبی، کی اس سے بڑھ کر مثال، تلاش کرکے بھی پیدا کرنی آسان نہیں!'' [۱]

یہ تھے مولانا عبدالماجد کی صحافتی طرز تحریر کے چند نمونے اور ان کی صحافتی زندگی کا ایک مختصر خاکہ۔ مولانا نے سچ کی ادارت سنبھالنے سے پہلے مختلف اخبارات وجرائد میں مضمون نگاری، تبصرہ نگاری، مراسلہ نگاری وغیرہ کی حیثیت سے جو حصہ لیا تھا اسے اگر نہ بھی شامل کیا جائے تو بھی باقاعدہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی صحافتی زندگی کی مدت تقریباً ۴۹ برس ہوتی ہے۔ مولانا نے صدق جدید کی اشاعت مورخہ ۲۹ / مارچ ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا کہ ''صدق اپنے پہلے نام سچ کے ساتھ جنوری ۲۵ء میں جاری ہوا۔ شروع کے چھ مہینے چھوڑ کر جب ادارت کی پوری ذمہ داری اپنے سر نہ تھی۔ اور درمیان کے بھی سال ڈیڑھ سال کے ناغہ کو چھوڑ کر کہنا چاہیے کہ پورے ۴۱ سال کا صحافتی تجربہ ہے'' اس میں ۷ برس کا اور اضافہ کر لیجیے تو ۴۹ برس کی صحافیانہ زندگی بجائے خود ایک بڑی مدت ہوتی ہے۔ اس مدت میں انھوں نے جس انداز کی صحافت کی اور اردو صحافت کو جو نیا رنگ وآہنگ دیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔

[۱] عبدالماجد دریابادی ''سچی باتیں'' مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ص: ۱۵۵
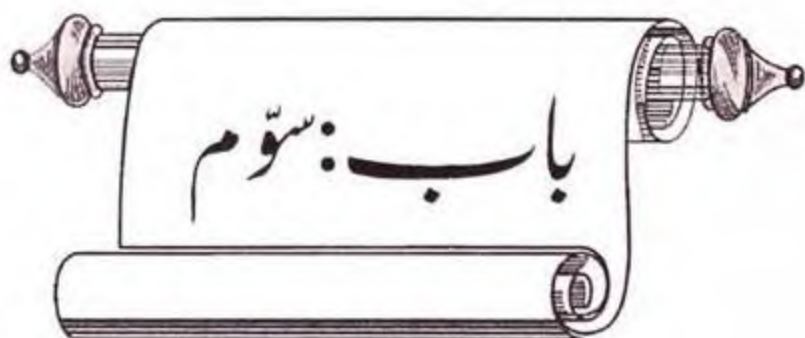
عبدالماجد دریابادی کی کالم نگاری

عبدالماجد دریابادی کی کالم نگاری

اُردو صحافت میں کالم نگاری کی روایت بہت پرانی ہے اور پورے ایک صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دانشوروں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں کسی زبان کے کالم نگاروں نے معاشرہ کی اتنی صحیح عکاسی نہیں کی جتنی اردو کالم نگاروں نے کی۔ اردو کے کالم نگاروں نے تمام سماجی خرابیوں، سیاسی برائیوں، اور معاشرتی مسائل اونچ، نیچ، چھوت چھات استحصال، غربت اور جدید تہذیب کی کمزوریوں کو بڑی تیکھی نظر سے دیکھا اور ان پر اکثر وبیشتر ہلکے پھلکے لیکن انتہائی موثر انداز میں لکھا۔ اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فن کالم نگاری کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

کالم کی تعریف واہمیت

کالم کے لغوی معنی صفحہ کا حصہ یا خانہ کے ہیں۔ اخبار یا رسالہ کا ہر صفحہ کالموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اردو کے موجودہ اخبارات کا کالم تقریباً دو انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی اخبار کے صفحے کے سائز کے مطابق ہوتی ہے۔ اصطلاح میں کالم اخبار میں روزانہ شائع ہونے والی موضوعاتی تحریر کو کہتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف امریکہ میں لکھا ہے۔

> ”کسی بھی اخبار میں مقررہ موضوع پر اپنے مخصوص انداز بیان و اسلوب میں لکھی جانی والی تحریر کو کالم کہتے ہیں۔“[۱]

---

[۱] احمد مقصود اقبال ”حیدرآباد میں اردو کالم نگاری“ غیر مطبوعہ مقالہ، ص:۹

احمد مقصود اقبال صاحب اپنے غیر مطبوعہ مقالہ ''حیدرآباد میں اردو کالم نگاری'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''اخبار میں مستقل مختصر اور موضوعات پر مشتمل تحریر کو کالم نگاری کہتے ہیں۔ عام طور پر کالم نگاری میں وقتی، قومی، ملی، ثقافتی، علمی وادبی تہذیبی مواد کو شامل کیا جاتا ہے۔'' [۱]

سید اقبال قادری مصنف، رہبر اخبار نویسی، کے خیال میں:

> ''کالم ایک ایسا صحافتی فیچر ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملہ کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔''[۲]

ہر اخبار میں کچھ مستقل عنوان ہوتے ہیں بعض کے تحت خبریں، اعلانات یا معلومات پیش کی جاتی ہیں اور بعض کے تحت مزاحیہ 'نیم مزاحیہ، دینی طبی اور سائنسی مواد شائع کیا جاتا ہے۔ ان مستقل عنوانات کو صحافتی اصطلاح میں ''کالم'' یا ''خصوصی کالم'' کہتے ہیں۔ اور لکھنے والے کے لیے ''کالم نویس'' یا ''کالم نگار'' کی اصطلاح رائج ہے۔

اردو صحافت میں ''افکار و حوادث'' ''تیر و نشتر'' آزاد قلم'' ''پھول اور کانٹے'' ''گلوریاں'' ''زیر و زبر'' اور ''سچی باتیں'' کافی جانے پہچانے کالم ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی 'سچی باتیں' کے زیر عنوان آخر تک کالم لکھتے رہے۔ ان کا یہ کالم صحافت کی دنیا میں کافی مشہور ہوا۔ لوگ مولانا کے اس کالم سے محظوظ و مستفید ہونے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ سادہ اور عام فہم زبان، چھوٹے چھوٹے جملے اور خوبصورت فقرے ان کے کالم کو چار چاند لگاتے ہیں۔ مسلم مسائل پر اکثر تبصرہ کرتے اور مختصر الفاظ میں بہت کچھ کہہ جاتے، مثال

[۱] احمد مقصود اقبال ''حیدرآباد میں اردو کالم نگاری'' غیر مطبوعہ مقالہ، ص:۹

[۲] سید اقبال قادری 'رہبر اخبار نویسی' ص:۳۱۸

کے طور پر وہ تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''جس طرح مسلمانوں کو صاف وصریح حق اپنی مسجد یں بنانے، ان میں نماز بالکل اپنے طریقہ پر پڑھنے، ان کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنے کا اور اپنے میتوں کو تمام تر اپنے طریقہ پر کفنانے، دفنانے کا اور اپنے کو مسلمان کہنے اور لکھنے کا اس سیکولر ملک میں حق حاصل ہے ٹھیک اسی طرح اور اسی درجہ میں اپنے لڑکوں کو اپنے یہ نظام تعلیم کے تحت پڑھاتے لکھانے اور تربیت دینے کا حق ہے یا نہیں''۔

اردو کالم نویسی میں طنز و مزاح کا عنصر ہمیشہ غالب رہا ہے جو اس کی کامیابی کا راز ہے کیونکہ طنز و مزاح سے جو چٹکی لی جاتی ہے اس کا اثر زیادہ اور دیرپا ہوتا ہے۔

کالم نگاری جدید صحافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ کالم نگار مختلف موجودہ مسائل پر تبصرہ نگاری کے ذریعہ پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور اہم مسائل کو توضیح کی ذمہ داری کامیابی سے انجام دینے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ مشہور کالم نویس کی رائے کا خیال بڑی بڑی حکومتوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ دراصل ان کے جائزوں میں دوراندیشی کا عنصر ہوتا ہے۔ وہ اپنے قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ کالم نویس اپنی معلومات کی فراوانی سے قارئین کو متحیر کرتے ہیں۔ وہ مبصر بھی ہیں اور شارح بھی۔ وہ مختلف النوع موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس لیے کالم نویسوں کو قلم کا شہنشاہ سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں کامیاب کالم نویسوں کو ''سیاسی پنڈت'' Political Pandits کا معروف نام بخشا گیا ہے۔[۱]

ہر اچھے اخبار میں ایک شگفتہ کالم کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تاکہ حالات حاضرہ پر

[۱] سید اقبال قادری 'رہبر اخبار نویسی' ص:۳۱۵

آزادانہ رائے ظاہر ہوتی رہی سید اقبال قادری اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''رہبر اخبار نویسی'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''کالم نویسی ایک تکنیکی ہنر ہے جس اخبار کے صفحات پر رائے کا اظہار کرنے والا مواد نہیں ہوتا وہ ایک بے روح اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اداریہ کی طرح کالم بھی ادارتی صفحہ کو تقویت بخشتا ہے۔ کالم خیالات کے اظہار کا ایک عمدہ اور پُر تاثر وسیلہ ہے۔ کالم کے ذریعہ ہزاروں قارئین کو دعوت فکر ملتی ہے۔''[۱]

کالم کے متعدد اقسام کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل چار اقسام زیادہ تسلیم شدہ اور مقبول ہیں۔

۱۔ رنگ برنگے کالم: اس کالم میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر مسئلہ اور ہر پہلو یا کوئی بات پر اظہار کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کالم لکھنے کے لیے کالم نویس کو آئے دن سینکڑوں واقعات مل جاتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، ثقافتی، علمی ادبی غرض کسی بھی موضوع پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

۲۔ ذاتی کالم: اس کالم میں کسی ایک موضوع یا کئی موضوعات پر رائے زنی کی جاتی ہے۔ مگر تحریر میں انفرادیت ہمیشہ برقرار رکھی جاتی ہے۔ یہی انفرادیت کا عنصر اس کالم کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایسے ذاتی کالموں میں حالات حاضرہ کے اہم پہلوؤں پر دلچسپ انداز میں ذاتی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔ جس کی مقبولیت کے سبب اخبار کی زیادہ کاپیاں فروخت ہوتی ہے۔

۳۔ مزاحیہ کالم: عوام ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں لکھی ہوئی تحریروں کا مطالعہ شوق

---

[۱] سید اقبال قادری 'رہبر اخبار نویسی' ص: ۳۱۷

سے کرتے ہیں۔ مزاحیہ کالموں میں ایسی ہی تحریروں کو جگہ دی جاتی ہے۔ ایسے کالم نویسوں کو معاشرہ کے مختلف واقعات سے بآسانی مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی فکاہیہ کالم تحریر ہو سکتا ہے۔ پرانے چٹکلوں کو نئے لباس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ شائع ہونے والے کالموں کے مداح قارئین کا حلقہ وسیع ہوتا ہے۔ اردو صحافت میں مزاحیہ کالموں کی تاریخ کافی روشن و منور ہے۔

خصوصی کالم: ایسے کالم مخصوص موضوعات پر لکھے جاتے ہیں جیسے ظلم، کھیل کود، اعلیٰ سوسائٹی، زراعت، تجارت سیاست، مذہب، فنون لطیفہ، ماحولیات، پکوان وغیرہ ایسے کالموں عموماً ایسے افراد لکھتے ہیں جو اپنے اپنے میدان عمل میں ماہر سمجھتے جاتے ہیں۔

اردو کالم نگاری کا آغاز وارتقاء

اردو کالم نگاری کے تدریجی ارتقاء کے بارے میں معلومات فراہم کرتے وقت اکثر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اردو صحافت میں کالم نگاری کی تاریخ تقریباً ایک صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک صدی صرف اردو کالم نگاری کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک صدی کے پورے ہندوستانی معاشرے کی تاریخ بھی ہے۔

ان سو برسوں میں ہندوستانی معاشرہ جن نشیب و فراز سے گذرتا رہا وہ ان کالموں میں عکس ریز دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر مبصروں کا خیال ہے کہ غالباً ہندوستان کی کسی زبان کے کالم نگاروں نے معاشرے کی اتنی آئینہ داری نہیں کہ جتنی اردو کالم نگاروں نے کی۔ ان کالم نگاروں نے تمام سماجی خرابیوں اور مسائل مثلاً اونچ نیچ، چھوت چھات، ظلم و زیادتی، مکرو فریب، نسلی و فرقہ ورانہ عصبیت کو بڑی تیکھی نظر سے دیکھا اور ان پر اکثر و بیشتر دلکش مگر بھر پور ضربیں لگائیں ہیں۔ اور بار بار ضربیں لگا کر بتایا کہ صحت مند معاشرہ کا وجود ضروری ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ مختلف کالم نگاروں کی درخشاں تحریروں سے منور ہے۔ابتدا میں طنزیہ ومزاحیہ کالموں کا آغاز ہوااور چند سال کے اندراندر یہ اردو صحافت کا جزولاینفک بن گیا۔مزاح نگاروں نے کالم نگاری کی رویت کو مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی جہتوں سے بھی آشنا کیا۔مقصود احمد کے مطابق اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی داغ بیل ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین کے اخبار''اودھ پنچ'' نے ڈالی۔اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین، کے علاوہ تربھون ناتھ ہجر،رتن ناتھ سرشار،مچھو بیگ ستم ظریف،جوالا پرشاد برق،اکبرآلہ آبادی قابل ذکر ہیں۔[۱]

اودھ پنچ کے بعد ہندوستان کے گوشے گوشے سے پنچ نکلنے لگے پنجاب پنچ،لاہور پنچ، جالندھر پنچ،آگرہ پنچ،دکن پنچ،اور نہ جانے کتنے ہی پنچ نکلے۔مگر جو مقام اودھ پنچ کو حاصل ہوا۔وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ان کے لکھنے والوں نے وہ بنیاد رکھی اور وہ فضا ہموار کی جواردو میں مزاحیہ کالم نگاروں کی روایت کو مستحکم بنانے کے لیے ضروری تھا۔چنانچہ ہندوستان کے مختلف رسائل واخبارات میں مزاحیہ کالموں کا رواج عام ہونے لگا تھا۔مقصود احمد رقم طراز ہیں:

> ''بیسویں صدی کے آغاز تک صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ اردو میں نہ صرف طنزیہ ومزاحیہ رسالے نکلنے لگے تھے۔بلکہ ہراخبار میں مزاحیہ کالم کی اہمیت کو بھی محسوس کیا جانے لگا تھا۔ان دنوں ملک کے سیاسی، سماجی حالات ہی ایسے تھے کہ بہت سی باتوں کو راست طور پر بیان کرنے کی بجائے طنزومزاح کے پیرائے میں پیش کرنا زیادہ موثر نظر آتا تھا۔چنانچہ ایسے ادیب بھی جن کا طنزومزاح سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔وہ بھی کالم نگاری کی طرف مائل ہوئے۔خواجہ حسن نظامی،

---

[۱] احمد مقصود اقبال''حیدرآباد میں اردو کالم نگاری''غیر مطبوعہ مقالہ، ص:۵۹

> عبدالجید سالک، چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالماجد دریابادی، یہ چند نام ہیں جن کا مقام و مرتبہ ادب میں بہت بلند و ارفع ہے۔ لیکن انہوں نے کالم نگاری بھی کی۔'' [۱]

اردو کالم نویسی میں طنز و مزاح کا عنصر ہمیشہ غالب رہا ہے جو اس کی کامیابی کا راز ہے۔ کیونکہ طنز و مزاح سے جو چٹکی لی جاتی ہے اس کا اثر زیادہ اور دیر پا ہوتا ہے۔ اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کا آغاز لکھنو سے ہوتا ہے لیکن بعد میں پنجاب، دہلی اور دکن طنز و مزاح کے مراکز سمجھے جانے لگے۔ ''زندہ دالان پنجاب'' کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ چراغ حسن حسرت نے اپنے ظریفانہ رسالہ ''شیرازہ'' کی اشاعت کے ذریعہ مزاحیہ کالم نگاری کو ایک نئی سج دھج عطا کی۔ اس کے لکھنے والوں میں ''عبدالمجید سالک'' ''محمود نظامی'' میراجی، کرشن چندر، کنھیا لال کپور، احمد ندیم قاسمی، حاجی، لق لق، ضمیر جعفری وغیرہ جیسے ادیب شامل ہیں۔

عبدالمجید سالک نے پورے تیس برس تک ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' میں کالم نگاری کی۔ انہوں نے اپنے کالم ''افکار و حوادث'' کے ذریعہ اردو کالم، کالم نگاری کو بام عروج کی منزلوں تک پہنچایا۔

بہ حیثیت مجموعی ہندوستان میں کالم نگاری کی روایت مستحکم ہے۔ فکر تونسوی لکھتے ہیں۔

> ''اردو زبان میں ایک صدی سے لکھے جانے والے کالم یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے کالم نگاروں نے جب بھی کالم کے لیے قلم اُٹھایا۔ گرد و پیش کی روزمرہ زندگی، سماجی اور سیاسی اور اقتصادی گم راہیاں اور تضاد

---

[۱] احمد مقصود اقبال ''حیدرآباد میں اردو کالم نگاری'' غیر مطبوعہ مقالہ، ص: ۶۰

ان کے قلم کے لپیٹ میں آ گئے۔ اور اگر چہ وہ ادب عالیہ کا مقام نہ پا سکے۔ لیکن پھر بھی ان کی نگاہ میں ایک خوشحال اور بہتر اور صحت مند سماج کا تصور متواتر جھلکیاں دکھتا رہا۔"[۱]

عبدالماجد دریابادی کی کالم نگاری

آزادی کے بعد جن کالم نگاروں نے اپنے لیے جگہ بنائی ان میں کئی نام آتے ہیں۔ لیکن ان ادیبوں نے اس فن میں اپنا لوہا منوایا۔ ان میں سعادت حسن منٹو، فکر تونسوی، نور اللہ خان، شوکت علی تھانوی، ابراہیم جلیس، ابن انشاء، احمد ندیم قاسمی، مجید لاہوری، شاہد صدیقی، تخلص بھوپالی، مجتبیٰ حسین، ساگر چند گورکھا، خواجہ احمد عباس، کنہیا لال کپور، اور عبدالماجد دریابادی قابل ذکر ہیں۔

عبدالماجد دریابادی وہ صاحب طرز عظیم المرتبت صحافی تھے جن کے نام سے کالم نگاری کی تاریخ ہمیشہ روشن رہے گی۔ عبدالماجد دریابادی نے تقریباً پچاس سال تک "سچی باتیں" کے زیرِ عنوان کالم لکھتے رہے۔ جن کی نظیر صحافت کی تاریخ میں ناپید ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اخبار "سچ" کا آغاز جنوری ۱۹۲۵ء سے کیا تھا اور اس کے دوسرے ہی نمبر سے عبدالماجد دریابادی نے اس میں "سچی باتیں" کے مستقل کالم کا آغاز کر دیا تھا۔ جس کا سلسلہ ان کی وفات (۶ر جنوری ۱۹۷۷ء) سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ بعد از وقت حکم عبدالقوی نے اپریل ۱۹۸۵ء تک دوبار صدق اور سچ کے پرانے شماروں سے برابر نقل کر کے شائع کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں نعیم الرحمن صدیقی ندوی مرتبہ "سچی باتیں" میں تحریر فرماتے ہیں۔

[۱] فکر تونسوی پندرہ روزہ "چنگاری" کالم نگار نمبر دہلی ۱۹۸۴ء ص:۵

"سچ" کے دوسرے شمارہ (۹رجنوری ۱۹۲۵ء) ہی سے مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے اپنے شہرہ آفاق کالم کا آغاز کیا۔ مولانا کا یہ افتتاحی کالم اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ بلا شائبہ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کی اردو صحافت میں اس کی مثال نایاب تو نہیں کمیاب تو ضروری ہے۔ اس کالم کا سلسلہ مولانا کی وفات (۶رجنوری ۱۹۷۷ء) سے کچھ عرصہ قبل تک جاری رہا۔ مولانا کی یہ "سچی باتیں" دینی اخلاقی، علمی، ادبی، فکری، تہذیبی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی موضوعات کی جامع ہوتی تھیں۔ ان میں فکر و تدبر اور تذکیر و موعظت کے ایسے بیش قیمت عناصر شامل ہوتے تھے کہ اس زمانہ کے موقر اخبارات وجرائد بڑی اہمیت کے ساتھ انہیں اپنے ہاں نقل رتے تھے مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوتا تھا، مسجدوں اور اصلاحی جلسوں میں انہیں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ مولانا دریابادیؒ قرآن مجید، سیرت نبویؐ اسوۂ صحابہ اور حالات صوفیہ سے عموماً وہ گوشے منتخب کر کے، سچی باتوں میں شائع کرتے تھے جن کی روشنی میں عہد حاضر کے مسلمانوں کی رہبری کا فرض انجام دیا جا سکے۔ مولانا کی یہ "سچی باتیں" ان کے کردار اور رجحانات و میلانات کی عکاس ہوتی تھیں۔ [۱]

مولانا عبدالمادد ریابادی کی قرآن وسنت سے وابستگی اور اسلام سے والہانہ عقیدت، ملی اور قومی ہمدردی یہی وہ چیزیں ہیں جن سے "سچ" کے کم وبیش سارے مشمولات ترتیب پاتے تھے۔ یکم رجنوری ۱۹۲۶ء کی "سچی باتیں" کا ایک مختصر اقتباس درج ہے جس میں ماجد نے اس بات پر تعجب اور تاسف کا اظہار کیا ہے کہ جو باتیں مسلمات اور یقینیات میں سے تھیں، اب ان پر بھی متفقہ تجاویز منظور کی جانے لگی ہیں، جیسے لڑکیوں کے شرعی ترکہ کا مسئلہ

[۱] نعیم الرحمن صدیقی ندوی، سچی باتیں، (کالموں کا انتخاب) ص:۶، ۷

عبدالماجد لکھتے ہیں۔

> ''کیا یہ شریعت کا کوئی اختلاف مسئلہ ہے۔کیا اس میں بھی سنی وشافعی، مقلد وغیر مقلد، صوفی دوہابی، اہل حدیث واہل قرآن کی راہیں جدا جدا ہیں۔کیا کسی گروہ علماء کے نزدیک لڑکیوں کا حصہ شرعی ثابت ہے اور کسی کے نزدیک نہیں بھی؟''[1]

''سچی باتوں'' کے اس اقتباس سے یہ قیاس نہ کیا جائے کہ اس میں بس یہی کچھ ہوتا تھا۔عبدالماجد محض عقل ونقل کے مباحث ہی کو یہاں درج کرتے اور ان سے نتائج مرتب کرتے تھے، بلکہ فطرت ومناظر فطرت سے بھی حکمت کی کشید کا سامان مہیا کرتے تھے۔ ذیل میں ''سچی باتوں'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں خالق سماوات کی برکات کو تخلیقی انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔

> ''زمین خشک، مردہ وبے جان پڑی ہوتی ہے جب آسمان سے پانی برستا ہے، اسی وقت ہر طرف تازگی وشادابی پھیل جاتی ہے۔سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ پھول کھلنے لگتے ہیں اور ذرہ ذرہ میں گویا جان پڑ جاتی ہے زمین میں تاریکی چھائی ہوتی ہے۔ہر چیز اندھیرے کے حجاب میں لپٹی ہوتی ہے جب آسمان پر طلوع آفتاب ہوتا ہے اور اس کی کرنیں زمین پر پہنچتی ہیں تو ہر شئے، روشن ہوجاتی ہے۔ہر طرف نور پھیل جاتا ہے۔کوئی چیز چھپی ہوئی یا دھندلی نہیں رہ جاتی اور ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے۔
>
> آفتاب جب چھپ جاتا ہے تو زمین پھر بے نور ہوجاتی ہے اور سارا منظر بے روپ بھیانک اور بے رونق ہوجاتا ہے۔جب آسمان پر چاند اور تارے طلوع ہوتے ہیں تو بدمنظری پھر دور ہوجاتی ہے۔

[1] عبدالماجد دریابادی اخبار''سچ'' یکم جنوری ۱۹۲۶ء ص:۱

درخت جب خشک ہو جاتے ہیں، سبزہ جل جاتا ہے، زمین جب پاسی ہو کر تپنے لگتی ہے، دریاوں کے لبوں پر جب پپڑیاں جم جاتی ہیں تو آسمان ہی کی بارش اپنے فیض و کرم سے ان سب کو سیراب، سب کو تروتازہ اور سب کو شاداب کر دیتی ہے۔ اگر آسمان کی دستگیری قدم قدم پر سہارا نہ دیتی تو آج نہ زمین موجود ہوتی نہ زمین کی دلچسپیاں اور خوش نمائیاں نہ زینتیں اور رونقیں، نہ آرائشیں نہ آسائشیں۔ [۱]

مولانا عبدالماجد کا لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ، جملہ جملہ اور سطر سطر معنی و بیان کی شگفتگی کی حامل ہے، اوران کی دُور رَس نگاہیں روزمرہ کے مشاہدات اور مناظرِ قدرت کے مطالعہ سے دانش آموزی اور حکمت آفرینی کا لطیف کام بکمال قادراندازی لے رہی ہے۔

''سچی باتیں'' کا یہ کالم مولانا عبدالماجد کے افکار و خیالات اور نظریات و میلانات کی اہم ترین نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ادبی، علمی، کلامی، تہذیبی، اصلاحی تمام قسم کے موضوعات آتے تھے اور عبدالماجد عام فہم مگر دل میں اُتر جانے وال پیرائے میں مسائل و مظاہر پر رائے زنی کرتے چلے جاتے تھے خصوصیت کے ساتھ تہذیب مغرب کی بے اصلی، کم نگاہی، سطح بینی اور نام نہاد ترقی پر عبدالماجد کا قلم بے حد رواں ہو جاتا تھا۔ وہ مغرب کے ساتھ مغرب ہی کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے یعنی اہل مغرب ہی کے ہاں سے ایسے مصنفین وافراد چن لیتے تھے جنہوں نے مغرب کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی مفاسد کا ایک بے رحم سرجن کی طرح تجزیہ کر رکھا ہوتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ مغرب کی بعض نارسائیوں او ربرائیوں کو عام نظری کی بجائے محدب شیشے سے دیکھتے تھے لیکن اس کے پیچھے اصل میں ان کا تمام تر اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر کارفرما ہوتا تھا۔ انہیں اندیش یہ تھا کہ کہیں مغرب کی یہ سراسر مادہ پرستانہ تہذیب مشرق کے فضائل کا گلا نہ گھونٹ دے کیونک اثر و نروذ کے اعتبار

[۱] عبدالماجد دریابادی اخبار ''سچ'' ۱۶ اگست ۱۹۲۶ء ص:۱

سے یہ تہذیب جدید ہر پرانی تہذیب سے زیادہ متاثر کن اور مہلک تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی اس تنقید مغرب کے پہلو کا ذکر کرتے ہوئے بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ مولانا کو تہذیب مغرب کے مفاسد تو نظر آتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر نہیں دیکھا۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ قدیم طبقے کی بھی اصلاح ضروری ہے۔ انہیں اپنے معاشرے کے مفاسد نظر نہیں آتے۔

اس قسم کے اعتراضات دراصل صدق کے وسیع مطالعے کے نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ ذیل میں عبدالماجد کی سچی باتوں سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جدید کی طرح قدیم پر بھی ان کی نظر تھی اور وہ خود احتسابی کے جذبے سے محروم ہرگز نہیں تھے۔ ماجد اپنی عبرت اندوزی کے چراغ صرف مغرب ہی کی برق پاشیوں سے روشن نہیں کرتے بلکہ مشرق کی کبریت سے بھی چلاتے ہیں۔ اخبار ۲۳ / مارچ ۱۹۴۶ کی ''سچی باتیں'' کے کالم کے تحت لکھنؤ کے کسی استاد کا یہ شعر

شفق گوں ہے ہوائے بام قاتل　　　　کبوتر پر کبوتر گر رہا ہے

درج کرنے کے بعد اس کے پُر تکلف، مبہم اور پیچ دار مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ ہمارے قدیم و کلاسیکی ادب کا بیشتر حصہ ایسی ہی بے مغز و بے مزا مبالغہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے اور دینی، اخلاقی تو خیر یہ کسی فطری جذبہ کی تسکین میں بھی ناکام رہا ہے اور اس میں الفاظ بدل بدل کر وہی فسق و معصیت کی شہوانیت و ابتذال کی باتیں ہیں۔ کالم کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

> ''نئے ادب اور نئی شاعری کی عریانیاں یقیناً لائق نفریں اور سزاوارِ ملامت، لیکن پرانے ادب اور پرانی شاعری کو صرف اس لیے بخش دیا

جائے گا کہ وہ قدیم ہے۔ معیار ہمارے ہاتھ میں صرف عقل و شریعت کا ہے، اس پیمانے سے پرانے کو بھی ناپا جائے گا اور نئے کو بھی جانچا جائے گا۔''[۱]

عبدالماجد کا یہی وہ اصلاح و احتساب کا جذبہ ہے جو''سچی باتوں'' کے تمام کالموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے سارے ادبی معرکے بھی اسی جذبہ کی غماز ہیں۔ علی جواد زیدی، ''سچی باتیں'' کے کالم کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سچی باتیں، وہ چھوٹا سا روزن ہے جس سے مولانا اپنے اطاق تنہائی کے باہر کی دنیا کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اس لنگڑی، لولی دنیا میں احتساب کے لے بڑا میدان پڑا ہے۔ اس اونٹ کی کون سے کل سیدھی ہے کسی شخص کے لیے یہ ناممکن ہے کہ اس دنیا کا ہمہ گیر احتساب کر سکے۔ مولانا کا احتساب مذہبی اور اخلاقی ہے۔ جب وہ ان جھروکے سے جھانکتے تو انہیں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا اور ان کا قلم چل پڑتا۔ ایسا احتساب دنیا سے الگ تھلگ رہ کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اپنے طنز سے اس احتساب کا بیڑا اُٹھایا۔ کسی ملک میں طلاقوں کی تعداد بڑھ جائے۔ کسی اسلامی ملک میں جوان لڑکیاں۔ بے پردہ اسٹیج پر آجائیں، (معاف کیجیے گا اسٹیج پر آئیں گی تو بے پردہ تو ہوں گی ہی) مصر و پاکستان میں آزادخیالی کے مظاہرے ہوں، زیردستوں پر کہیں زیادتی ہو، ہندوستان میں قول و عمل کا کہیں تضاد نظر آئے، مولانا خورد بین لگائے سب دیکھتے رہتے ہیں اور انہیں اپنے طنزیہ تیروں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔''[۲]

---

[۱] عبدالماجد دریابادی اخبار ''صدق'' مارچ ۱۹۴۶ء ص:۱

[۲] عبدالماجد دریابادی ''اک چراغ نہ تھا نہ تھا'' مشمولہ نیا دور، اپریل، مئی ۱۹۷۸ء ص:۴۸

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' کے مقاصد اور اس کا نصب العین کو واضح کرتے ہوئے کہیں لکھا تا کہ ''الصدق ینجی والکذب یھلك'' لسان الصدق کا دستور العمل اور اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستے پر لائے جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ انہیں ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر ''سچائی کی زبان'' کیونکر شیریں معلوم ہوگی، یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا جو اگرچہ تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اس زمانہ کو دور نہ سمجھ جب کہ صدق کا ''ینجی'' ہونا اور کذب کا یھلك ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔

عبدالماجد دریابادی کے کالموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشرقی روایت کا احترام کرتے تھے۔ مشرقی کلچر سے موتی چنتے اور اپنی فلسفیانہ بصیرت کے ذریعہ اس کی آب سے نئی نسل کو روشناس کراتے رہتے تھے۔ اگر ہم ان کے عہد کی لکھنو کی تہذیبی، ادبی، اور سیاسی زندگی کو سمجھانا چاہتے ہیں تو عبدالماجد دریابادی کی زندگی اور اخبارات کا پہلے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر کہ ان کی ''سچی باتیں'' میں اس زمانہ کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کالموں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ معمولی معمولی اور چھوٹی چھوی باتوں میں بھی حکمت و دانائی کے پہلو تلاش کرلیتے ہیں۔ ایسے واقعات جن کو ہم قطعی غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں ان میں وہ نکتہ آفرینی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''معیار حیات کی بلندی، کا کھل کر صاف وسلیس ترجمہ ''اسراف پسندی'' کر دیا جائے تو شاید دنیا کا احمق ترین شخص بھی اس کے فریب میں نہ آئے۔ گو اسی کو خوش نما اور نظر و فریب قالب، معیار زندگی کی بلندی، کا ایسا دیدیا گیا ہے کہ اچھے اچھے ہوش مندوں اور دانشوروں کی عقل چکرا گئی۔ اور سب اسی کے دام میں پھنستے چلے جاتے۔ جیسے یہ

کوئی بڑی اونچی چیز ہے قناعت پسندی کو اس نظروں میں حقیر و ذلیل بنا دیا ہے اور حرص و ہوس کی وہ آگ سینوں میں بھڑکا دی ہے جس پر ہر جدید ترقی تیل کا کام دیتی اور آگ بجائے بجھنے کے اور زیادہ ہی بھڑکتی ہی چلی جاتی ہے۔'' [۱]

عبدالماجد دریابادی کے اس مشہور کالم پر ابوالفہم وحید علی خاں نے اپنی مضامین کی کتاب ''خوش بو'' میں یوں تبصرہ کیا ہے۔

''اس کالم میں اخبار خبروں پر مختصر مختصر تبصروں میں تلور جیسی تیزی دکھانے والے کبھی جملے، کبھی ایک لفظ وہ کام کر دیتے ہیں جو لمبے لمبے مضمون نہیں کر سکتے۔ یہ اخباری اور روزمرہ کی خبروں پر'' وقتی تبصرے'' بھی ادب کا ایک جز بن گئے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''سچی باتیں'' جیسا کالم لکھنے کی ممکن کوشش بہت سے اخباروں نے کی لیکن وہ بات پیدا نہ کر سکے۔ سچی باتیں، صدق جدید کی صفحات سے نکل کر ملک بھر کے اخبارات میں ہر ہفتہ نقل ہوتی تھیں۔ صحیح معنوں میں وہ نثر کے اکبرالہٰ آبادی ہیں۔ ان کا طنز کہیں نشتر ہے، کہیں چٹکی ہے؟ کہیں تازیانہ اور کہیں صرف گدگدی۔''[۲]

مختصر یہ کہ ''سچی باتوں'' کا کالم عریانیت، اردو دشمنی، مسلم بے زاری، مذہبی مقامات کی بے حرمتی، منافقت، سائنسی استحصال، تہذیب سے عاری فلموں، گاندھی جی کی تعلیمات سے بے اعتنائی، مغربی ریشہ دوانیوں، ممالک اسلامیہ کی بے عملی، بے دینی، فرقہ واریت، تخریب کاری، خوشامد، ارباب نشاط، جنسی بے راہ روی، فرقہ وارانہ فسادات، فرقہ پرست تنگ نظر جماعتوں، اسراف بے جا، ماضی سے بے تعلق، اردو، فارسی اور عربی تعلیم سے بے

[۱] ہفتہ وار ''صدق جدید'' لکھنو جلد ۱۲۔ ۵۲
[۲] ابوالفہم وحید علی خاں ''عبدالماجد دریابادی'' مشمولہ، خوشبو ص: ۱۳

پروائی، مسلم اداروں پر تعصب کی یلغار، قانون کی بے حرمتی اور بے دینی کے خلاف ایک مسلسل احتجاج ہے۔

جہاں تک عبدالماجد دریابادی کے کالم کے اسلوب اور صحافتی تحریروں کا طرز بیان کا تعلق ہے اسے ایک مستقل باب کے تحت جائزہ لیا گیا ہے۔
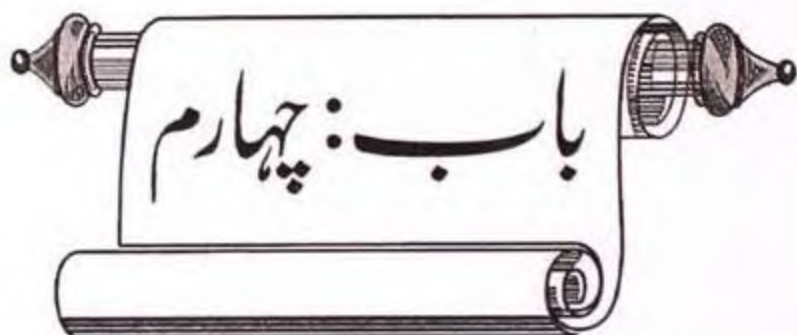
عبدالماجد دریابادی کی صحافت کا تنقیدی جائزہ

عبدالماجد دریابادی کی صحافت کا تنقیدی جائزہ

مولانا عبدالماجد دریابادی نے جب سے ہوش سنبھالا اُن کے زمانے میں شبلی، اکبر الہ آبادی کا ادبی دنیا میں طوطی بول رہا تھا۔ مولانا محمد علی اپنی تقریروں اور تحریروں کے باعث سیاسی بساط پر چھائے ہوئے تھے۔ غیر مسلموں میں بھی ایک سے ایک عالم و فاضل فلسفی، مدبر اور سیاست داں موجود تھا۔ معاصرین میں ابوالکلام آزاد، مولانا سیلمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی جیسے جید عالم تھے۔ صحافیوں میں ظفر الملک، مولانا محمد علی، جالب مرحوم، نیاز فتحپوری جیسے اکابر تھے۔ ان میں سے بہتوں سے مولانا مرحوم کے گہرے تعلقات تھے اور ان سے برابر خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔

ہندوستان کے طول وعرض سے نکلنے والے کم وبیش سارے رسائل میں مولانا عبد الماجد کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان میں الندوہ، ادیب، العصر، الناظر ہمدم، ہمدرد، المعارف، صبح امید، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا نے جب سے ''سچ'' اخبار کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لی، اُس وقت سے وہ اپنے اخبار میں مسلسل لکھتے رہے۔ سچ اخبار بند ہونے کے بعد ہفتہ روزہ ''صدق'' پھر ''صدق جدید'' میں ان کا اشہب قلم برابر دشتِ صحافت کی پرخار وادیوں کی سیر کرتا رہا۔ یہ عرصہ کم وبیش پچاس پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ کی صحافتی کارناموں اور ان کی تمام خصوصیات و امتیازات کا احاطہ کرنا دقت طلب بھی

ہے اور وقت طلب بھی۔ دقت یہ کہ وہی شخص ان کے گونا گوں کمالات پر قلم اٹھا سکتا ہے جو خود تقریباً اتنا ہی صاحب کمال ہو، اور وقت طلب یوں کہ مولانا مرحوم کی انشا پرداز صحافتی تحریریں ساٹھ سال سے زیادہ مدت پر محیط ہے۔ پھر ان کی ذات اور شخصیت کے متعلق بھی اعتماد کے ساتھ وہی شخص قلم اٹھا سکتا ہے جسے مولانا کا فیض صحبت کافی عرصہ تک حاصل رہا ہو۔

بہرحال مندرجہ ذیل سطور پر ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے کہ مولانا مرحوم کی تحریروں کی خصوصیات و امتیازات کو اجاگر کیا جائے۔ راقم اس میں کہاں تک کامیاب رہا، اس کا فیصلہ اہل علم وادب ہی صحیح کر سکتے ہیں۔

مولانا دریابادی نے صحافت کو ہمیشہ ایک ایک مشن اور ایک عبادت کے طور پر اختیار کیا تھا۔ انہوں نے صحافتی زندگی کو ایک پیشہ اور ذریعۂ معاش کے بجائے ایک مشن اور اس کے مطالبوں کی بدولت عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی بجا آوری کی شکل میں قبول کر کے زندگی بھر نبھایا۔ اس لیے اس میں عبادت جیسا انہاک اور وابستگی بھی آخر تک قائم رہی، اسی انہام اور مشغولیت کی بدولت وہ اتنا زبردست اور معیاری ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں جو ایک یا چند افراد کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ اپنی تصنیف و تالیف اور اپنی تحریر کے ذریعہ اردو کی جتنی خدمت کی، جیسی مستعدی اور ہمت کے ساتھ وہ آدھی صدی سے زیادہ مدت تک تخلیقی کام میں منہمک رہے، اس انہاک اور ان تھک کاموں کے ذریعہ انھوں نے ادب وصحافت کے دامن کو جتنا وسیع اور مالا مال کیا وہ یقیناً فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی کتابوں اور اپنے افکار، اپنے جذبہ اور اپنے اسلوب سمیت اردو ادب وصحافت کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ان کی تحریروں میں غزالی کا مستحکم ایمان، حافظ ابن حجر کی ژرف نگاہی اور گہری علمیت، شبلی کی مورخانہ نظر اور غالب کا نثری سلیقہ، اکبر الہ آبادی کا طنزیہ اسلوب نظر آتا ہے۔ صحافت کو علمی رنگ اور ادبی اسلوب کے ساتھ برتنے اور نباہ لینے کی صلاحیت ان کے قلم سے

زیادہ کسی اور اردو صحافی میں نہیں ملتی، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد دوسرے صحافی ہیں جنھوں نے صحافت میں علمی شان اور ادیبانہ شگفتگی کے ساتھ شخصی وقار کو قائم رکھا۔ اور تبصروں کو شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے مضمون کو ادا کر دینا ان کی تحریر کی ایسی خصوصیت ہے جس کی مماثلت تو کیا تقلید بھی کسی سے ممکن نہیں، زبان اور بیان پر ان کی پوری گرفت اور مکمل قدرت کا اظہار ان کی تحریر کی ایک ایک سطر اور ایک ایک فقرے سے ہوتا ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں ایسی مہارت اور فنی کمال بہم پہونچایا تھا کہ ان کے رنگ میں دس جملے بھی لکھ لینا کسی کے لیے آسان نہیں، ضرب الامثال، محاوروں، روزمرہ اور تلمیحات پر ان جیسا عبور ان کے بعد شاید ہی کسی بڑے سے بڑے اردو ادب کو حاصل ہو سکے، یہ عناصر جو ان کی تحریروں میں شگفتگی، قوت اور زبردست خیال انگیزی اور تحریک کو پیدا کرتے ہیں، دراصل غزل کے بنیادی عناصر ہیں، اور ان کا کامیاب استعمال نثر میں مولانا عبدالماجد کے سوا کسی سے ممکن نہ ہو سکا۔

ذیل میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے اخبارات سے چند منتخب اقتباسات پیش کر کے ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

ہفتہ وار ''صدق جدید'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اخبارات کا فائدہ جنگ کے واقعی چھڑ جانے میں نہیں لیکن اس میں ضرور ہے کہ خبریں برابر جنگی قسم کی اور جنگ کو قریب لانے والی ''سنسنی خیز'' قسم کی برابر نکلتی رہیں، روس، جنگ عظیم ثانی کے زمانہ میں برطانیہ کا بہترین دوست و حلیف تھا۔ جنگ کے ختم پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو خبیث ترین قسم کا انسان دشمن ہے! جن درس گاہوں، خصوصاً ابتدائی درس گاہوں میں تربیت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اپنی قوم کے جن لوگوں نے جنگ میں زبردست حصہ لیا ان کو ''ہیرو'' سمجھا جائے

اور انھیں کی عظمت دلوں میں بٹھائی جائے۔ وہاں کے فارغ طلبا میں جنگ جوئی اور جنگ پسندی پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ ساری قوم میں اسی طرح دوری قوم کے خلاف تعصب اور بغض کا زہر ملتا اور پھیلتا رہتا ہے، اور اخبارات اس آگ کو ہوا دینے کو ہر وقت آمادہ اور کمر بستہ رہتے ہیں۔''[۱]

مندرجہ بالا اقتباس نہ صرف رمزیت سے بھرپور ہے بلکہ پر مغز و ہوشمندانہ بھی ہے۔ دیکھئے کتنی بے لاگ اور سچی تنقید ہے، لگاوٹ کا شائبہ بھی نہیں۔

ایک اور تحریر کا نمونہ ''صدق جدید'' سے ملاحظہ کیجیے، جس میں 'وحدت ادیان' کی پوشیدہ مضمرات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''کچھ ایسا ہی افسوں شیطان نے وقت کے بڑے بڑے افلاطونوں کے کان میں پھونک دیا ہے اور اچھے اچھے دانایان روزگار وحدت ادیان کی میٹھی لوریوں کے اثر میں آ کر جھومنا اور اونگھنا شروع کر دیا ہے۔ وحدت ادیان کا مسئلہ بجائے خود جتنی بھی حقیقت رکھتا ہو آج جس سیاق میں چلایا جارہا۔ اس کے لحاظ سے تو اسلامیت کے حق میں قطعی پیام ہلاکت ہے''۔[۲]

مولانا عبدالماجد ہمیشہ بڑے بڑے دلائل و حوالوں سے احتراز کرتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے جملوں میں، اپنے انشاپردازی کے خاص طرز سے قاری کی نفسیات اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''پہاڑ اور پہاڑوں غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگ ریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج پڑی ہوتی ہے۔ جنھیں انسان اور جانور ہر

---

[۱] ہفتہ وار ''صدق جدید'' ۲۸ر فروری ۱۹۵۸ء ص:۱

[۲] ہفتہ وار ''صدق جدید'' ۲۹ر فروری ۱۹۵۴ء ص:۲

وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔لیکن انھیں میں کوئی سنگ ریزہ لعل و یاقوت بن کر نکلتا ہے جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔اس کو کوئی اگر توڑ ڈالے تو کیا گزر جائے گی۔سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے لیکن انھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا۔جنگل میں خودرو پھول اور پتے، درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں لیکن گلاب کی تازہ اور شاداب کلی بزم ہستی کو معطر کرنے کے لیے ہوتی ہے یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برق کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟''

اس عبادت میں حسن و جمال کی موجیں رقصاں نظر آتی ہیں۔اس کو پڑھنے سے ہم پر سرور و انبساط کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔انشا پردازی کے لحاظ سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ عبادت مولانا ابوالکلام آزاد کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے پہلے اخبار ''سچ'' کے دوسرے شمارے ہی سے ''سچی باتیں'' کے زیر عنوان مستقل کالم لکھنا شروع کر دیا تھا۔اس کالم میں اخباری خبروں پر مختصر مختصر تبصرے اور عام مسلمانوں کی صلاح وفلاح کے لیے حکمت و موعظت کے موتی بکھرے ہوتے تھے۔ان کالموں کا انتخاب مولانا مرحوم کی حیات ہی میں کتابی شکل میں شائع ہو کر اہل علم سے داد حاصل کر چکے تھے۔

سب سے پہلے اخبار 'سچ' اور 'صدق' کے کالم ''سچی باتیں'' کا ایک حسین انتخاب حکیم بلال اکبری نے ''سچی باتیں'' کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا۔ان مضامین کو تین

ابواب ''آیات بینات'' ''احادیث طیبہ'' اور ''اسوہ حسنہ'' میں تقسیم کیا گیا۔ اسوہ حسنہ کے تحت سیرت رسول ﷺ کے بعض پہلوؤں کے علاوہ بزرگان کرام اور عام صالحین امت کے اعمال حسنہ کا بھی ذکر خیر ہے۔ فاضل مرتب نے سچی باتوں کے مضامین کو بڑی سلیقہ مندی سے مضمون کے عین مطابق سرخیاں بھی لگائی ہے۔ کہیں کہیں سرخیاں مضمون سے میل نہیں کھاتی ہیں۔

فاضل مرتب نے مضامین کے انتخاب میں حوالہ کی حاجت محسوس نہیں کی۔ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ مضامین سچ اور صدق کے کس شمارہ سے ماخوذ ہیں۔ کتاب کے شروع میں طبع اول اپریل ۱۹۴۸ء ذکر ہے اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''سچی باتوں'' کے کالم کا آغاز جنوری ۱۹۲۵ سے کیا تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے کالمس جنوری ۱۹۲۵ء تا اپریل ۱۹۴۷ء کے درمیانی رصہ یعنی ۲۲ سال کے درمیانی مدت کے شماروں سے ماخوذ ہیں۔

مرتبِ کتاب ہلال اکبری، مولانا عبدالماجد دریابادی سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ عقیدت کی حد تک ان کا احترام کرتے ہیں۔ کتاب کے شروع میں ''اپنی باتیں'' کے عنوان سے ایک وقیع مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اسی مقدمہ میں وہ مولانا عبدالماجد اور ان کے کالم سچی باتوں کے متعلق رقم طراز ہیں۔

> مولانا کی طرز تحریر کے متعلق کچھ کہنا تو تحصیل حاصل ہے یہ بالکل سچ کہا ہے جس نے کہا کہ کو مولانا طنز نگاری کے شہنشاہ ہیں۔ مولانا کے استفہامی جملے اور مخاطبف کو دل سے جواب طلبی کی تاکید عجیب اثر رکھتی ہے۔ دل محسوس کرنے لگتا ہے کہ مجھے یہ ہونا چاہیے تھا اور میں کیا ہوں، دماغ سوچنے لگتا ہے کہ واقعی تاریکی سے روشنی میں آنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے جس کو پانی سمجھا تھا حقیقتاً سراب سے زیادہ کچھ بھی

حقیقت نہیں رکھتا اور جس چشمہ شیریں سے پیاس بجھ سکتی ہے وہ سامنے ہی تو موجود ہے۔" [۱]

فاضل مرتب نے اشاعت سے قبل مولانا عبدالماجد دریابادی سے تحریر اجازت نامہ بھی لیا تھا۔ خط کے الفاظ تحریر ہیں۔

"آپ نے بے شک محبت اور سلیقہ مندی دونوں کے ساتھ یہ "سچی باتیں" جمع کیں اور ترتیب دی ہیں۔ صحیح عنوانات آپ کے حسن ذوق کی دلیل ہیں آپ انہیں جب چاہیں چھاپ سکتے ہیں۔ دعا گو دعا گواہ (عبدالماجد) [۲]

پیش آئند اوراق میں "سچی باتیں" کے اسی انتخابی مجموعے سے اخذ کر کے مولانا عبد الماجد کے کچھ کالموں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

معجزہ قرآن اور جوہری بم

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اولین مقصد تھا۔ سچی باتوں کی کالم نویسی میں انہوں نے اسی کا بیڑا اٹھا۔ مولانا اس مضمون میں دور جدید کی ایک مہلک ایجاد "جوہری بم" کا قرآنی آیات سے تقابل کر کے مسلمانوں کو دعوت فکر کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ دنیا میں ہونے والی عملی و سائنسی ترقیات اور تحقیقات و ایجادات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔

مولانا عبدالماجد ایٹم بم (جوہری بم) کو سائنس کا "جدید ترین معجزہ" سے تعبیر کرتے

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری "سچی باتیں" ص:۱۲

[۲] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری "سچی باتیں" ص:۸

ہیں۔ایٹم بم جو ہولناک تباہی کا باعث بنتا ہے اس کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''ذرہ جو جسامت میں اس قدر حقیر اور ضخامت میں اتنا صغیر ہوتا ہے کہ آنکھ سے نظر ہی نہیں آسکتا۔ جب وہ پھٹتا ہے تو قلعوں کو ہلا دیتا ہے، پتھروں کے درودیوار کو جنبش میں لے آتا ہے، بیسوں نہیں، پچاسوں بلکہ سینکڑوں میل کے رقبہ میں زلزلہ پیدا کر دیتا ہے۔'' [۱]

اس تمہید کے بعد قرآن کی ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں قیامت کے قریب آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے۔ السماء شق۔ مولانا عبرت کے لیے یہ سوال کرتے ہیں ''ذرہ کے پھٹنے کا جب یہ عالم ہے تو آسمان کے پھٹنے سے ظاہر ہے کہ کیا حشر برپا ہو کر رہے گا'' قرآن نے شق، انفطر، انشق (جس کا معنی پھٹنے کے ہیں) کا لفظ کثرت سے استعمال کیا ہے اور ایٹم بم کی تباہی بھی پھٹنے سے ہی ہوتی ہے مولانا عبدالماجد یہاں دونوں کے مشترک معنی سے ایک لطیف نکتہ نکالتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

''اب جا کر کچھ روشنی پورے مسئلہ پر پڑی کہ قرآن مجید نے قیامت کی ہولناکیوں اور ہلاکت آفرینیوں کے سلسلہ میں آسمان کے لیے ''پھٹنے'' ہی کا لفظ کیوں بار بار استعمال کیا ہے اذا السماء انشقت اذا السماء انفطرت وغیرہ یہاں تک کہ انسان کی شدید مشرکانہ گستاخیوں پر بھی یہی لفظ لایا ہے۔ والسموت ینفطرون، اب کچھ کچھ روشنی، انشقاق وانفطار کے معنی پر پڑی! سائنس کے ''معجزہ'' نے طوعاً خواہ کرہاً قرآن کے معجزہ پر ایمان تازہ کر دیا!'' [۲]

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص:۳۱۹
[۲] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص:۳۲۰

قیامت کے تائید سائنسی کی زبان سے

آئے دن سائنس کی نت نئی انکشافات و اکتشافات قرآنی آیت کی تصدیق کرتے جا رہے ہیں۔ بہت سے مسلم دانشوروں نے سائنسی معلومات کو قرآنی آیت پر انطباق کر کے دین اسلام کی حقانیت کو واضح کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد بھی دانشورانہ انداز اور اپنے منفرد اسلوب میں قرآنی آیات کی روشنی میں سائنسی معلومات کی تشریح وتعبیر کی کوشش کرتے ہیں۔

پیش نظر کالم میں مولانا عبدالماجد نے ایک ماہر فلکیات کی کتاب Birth and Death of the Sun کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں لکھی گئی معلومات کو قرآنی آیت سے جوڑ کر کچھ نئے نکات پیدا کرتے ہیں۔ ذیل میں چند اقتباسات درج ہیں۔

(۱) ''ایک بات تو یہ ملی، کہ آفتاب اور سارے نظام شمسی کی پیدائش کو تقریباً ۲۰ کھرب سال ہوئے! گویا اس کی تصدیق ایک ماہر فن کی زبان سے ہوگی کہ آفتاب اور ماہتاب اور ستارے سب حادث ہیں۔''

(۲) ''دوسری بات یہ ہاتھ آئی کہ آفتاب اپنے عنصر ترکیبی یعنی ہائڈروجن وغیرہ کو بڑی احتیاط سے سنبھال سنبھال کر استعمال کر رہا ہے اس لیے بھی ۲۰ کھرب x۱۰ سال یعنی دو نیل سال تک اور زندہ رہے گا۔ اس سے تصدیق ہوگئی کی کہ آفتاب اور ماہتاب اور ستاروں کو ایک روز بہر حال فنا ہونا ہے۔ اور چشم کائنات کو اذا الشمس کورت، واذا النجوم انکدرت۔ واذا الکواکب انتثرت وغیرہ کا نظارہ کرنا ہے!۔''

(۳) ''تیسرے پتہ اس کا چلا کہ آفتاب روز بروز گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی گرمی کی شدت ایک دن زمین والوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گی، اور روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ سب اس سے جل جائے گا۔ مذہب نے اگر اس کیفیت

کو یوں بیان کر دیا کہ آفتاب ایک روز سوا نیزے کے فاصلہ پر آ جائے گا، تو کیا بیجا کہا؟''

(۴) ''چوتھی گرہ یہ کھلی کہ نئے نئے ستارے آہستہ آہستہ پیدا ہوتے جا رہے ہیں، اور پرانے فنا شدہ ستاروں کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ سلسلہ آفرینش جاری ہے اور اختر آفریں اپنا کام کر کے معطل نہیں ہوا ہے۔ کل یوم ھو فی شان کی یہ کیسی پیاری تفسیر نکل آئی!''[۱]

ان چار نکات کے بعد سامان عبرت کے لیے رقم طراز ہیں۔

''سائنس داں بیچارے کو مذہب سے مس نہیں اور اسلام کا تو اس نے نام تک بھی شاید نہ سنا ہو۔ اپنی دھن میں اپنے فن کے متعلق لکھتا چلا گیا ہے لیکن یہ کیا ہے کہ قلم سے جو کچھ نکلا ہے، اس سے ہمارے حقائق کی تائید و تصدیق ہی ہوتی گئی ہے!۔۔۔۔۔ کام کسی کا بھی کیا جائے نام اس کا کچھ ہی رکھ لیا جائے۔ سب آخر میں تحلیل ہو کر اللہ اور اللہ کے دین ہی کا کام جا کر ٹھہرتا ہے!۔''

دین کے خادم

چھوٹی چھوٹی باتوں سے دانشوارنہ و حکیمانہ نتائج اخذ کرنا ہر ایک کی بس کی بات نہیں۔ یہ اسی کی بس کی بات ہے جس کی نظر وسیع اور فکر عمیق ہو۔ آسمان کے ستاروں پر کس کی نظر نہیں پڑھتی۔ کسی نے بھی ان کو شمار کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ ماہر فلکیات نے بھی مریخ، مشتری، عطارد وغیرہ نو دس ستاروں کے نام رکھ کر چھوڑ دیا۔ لیکن کل تاروں کے نام کون رکھے؟ اور ان کی گنتی کون کرے؟ اگر بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعہ اختر شماری کا کام شروع کیا جائے تو لاکھ دو لاکھ نہیں ۱۴۱ ارب تک پہنچ جائے گی۔ مولانا کے کالم کا مندرجہ ذیل اقتباس اسفہامی انداز میں کس قدر دلچسپ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۳۱۳، ۳۱۴

''زحل، زہرہ، مریخ، مشتری، عطارد وغیرہ بہت سے تاروں کے نام سے ہم آپ سب واقف ہیں، لیکن کل ۱۴۱ارب تاروں کے نام بھی تو ۱۴۱ارب ہی ہوئے؟ یہ کس ڈکشنری میں ملیں گے؟ کس نے اب تک اتنی ہمت کی ہے؟ سنئے کوئی مشین بالفرض ایسی نکل بھی آئی، جو بے تحاشہ یہی نامزدگی کا کام شروع کردے اور ہر منٹ نہیں، ہر سکنڈ، کھٹا کھٹ، ایک ایک تارے کا نام تجویز کرتی چلی جائے تو بھی آپ کو اندازہ ہے کل کل کتنی مدت لگے گی؟ کیا سال دو سال؟ جی نہیں، پھر کیا دس، بیس پچاس سال؟ پوری ایک صدی؟ یہ بھی نہیں۔ پورے سترہ سو سال! اور یہ نامزدگی بھی صرف معلوم تاروں کی ہوئی، نامعلوم پھر بھی نامعلوم رہے، غیر موسوم رہے۔ ان نامعلوموں کی تعداد خود بھی نامعلوم! انسان کے جہل کا دائرہ اس کے علم سے کتنا بڑا ہے۔ اور وما یعلم جنود ربك الاھو کی یہ تفسیر دل پذیر نادانستہ وغیر شعوری طور پر سہی، بڑے بڑے مہندسوں، ہیت دانوں، فلک پیما ماہرین فن کی زبان سے بہر حال ہو رہی ہے۔ وان من شئی الا یسبح بحمدہ۔[۱]

مندرجہ بالا اقتباس میں ''انسان کے جہل کا دائرہ اس کے علم سے کتنا بڑا ہے'' کس قدر معنی خیز جملہ ہے۔ آج کے روشن خیال مادہ پرست اشخاص کے لیے نشتر سے کم نہیں۔ اس اقتباس میں قرآنی آیت کا برمحل استعمال مضمون کے عین مطابق ہے۔ جیسے انگھوٹھی میں نگینہ۔

اگر آدمی صحیح نقطہ نظر سے جدید علوم کا مطالعہ کرتا ہے تو کہیں بھی گمراہ نہیں ہوسکتا۔ کسی بھی جگہ اس کا ایمان ڈگمگاتا نہیں۔ نقطۂ نگاہ کا صحیح اور غیر جانب دار ہونا ہی اصل چیز ہے۔ اسی پہلو پر زور دیتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص:۳۱۲

بے دینی پھیلانے، والے علوم بھی وہ حیاتیات ہو یا نباتات' ریاضی ہو یا ہیئت اگر چہ صحیح نقطہ نظر سے مطالعہ کیے جائیں تو انشاء اللہ دین کے خادم ہی ثابت ہوں گے اور ایمان گھٹائیں گے نہیں، کچھ بڑھا ہی دیں گے بڑی گمراہی اور اصلی زہر ان مادی علوم کی نفس تعلیم نہیں، بلکہ غلط نقطہ نظرے سے ان کی تعلیم ہے۔ بجز ان چیزوں کے جو نص سے حرام قطعی ہیں، باقی بڑی گنجائش اس کی ہے کہ جو چیزیں مشتبہ یا ذو جہتیں ہیں، صحیح نقطہ نظر سے کام لے کر زہر کا تریاق میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور جو راہ کے کانٹے ہیں، انہیں کو مہکتے ہوئے پھول بنالیا جائے۔ سائنس، فلسفہ، ادب، شعر سب اسی فائدہ میں آجاتے ہیں۔"[۱]

مکر اللہ

مغرب کی اقبال مندی اور اس کے عروج سے کون مرعوب نہیں؟ عموماً مسلمان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان یورپ اور امریکہ کو امام گردان کر ہر معاملہ میں ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور تو اور روشن خیال علماء بھی جب امریکہ کی بات آتی ہے تو طرح طرح کی تاویلات سے ان کی تائید کرتے ہیں اور ان کے جاہ وحشم سے متاثر ہو کر ان کے آگے سر تسلیم خم کرتے۔ مولانا عبدالماجد، علامہ اقبال کی طرح یورپ کی علمی وفکری میخانوں سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے یہ ظاہری طمطراق اور خوشحالی حقیقی فلاح کی ضامن نہیں ہے۔ اسی لیے وہ وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کرتے ہیں کہ مغرب کی پیروی میں تمہاری کامیابی نہیں ہے بلکہ تمسک بالکتاب والسنت میں ہی تمہاری دنیاوی وآخروی فلاح ہے۔ اقتباس پیش ہے۔

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری "سچی باتیں" ص: ۳۱۳

''آج آپ کو سودخواری کی تلقین دی جاتی ہ اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دیکھیے مغرب کی سودخوار قومیں کیسی خوشحال ہیں، آج آپ کی شریعت شکنی کا سبز باغ دکھایا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ دیکھیے مغرب کی اقبال مند قومیں ان قیود سے آزاد ہو کر کیسی کیسی ترقیاں کر رہی ہیں۔ کلام پاک کی جو تصریح آپ کی نظر سے گزری، اس کے بعد اس قسم کے دلائل دشوائد کا کوئی وزن رہ جاتا ہے!''

مولانا عبدالماجد اس کالم میں سورۂ انعام آیت: ۴۴ کو بنیاد بنا کر آگے لکھتے ہیں۔

''خوش قسمت، اور اقبال رشک وہ قومیں نہیں جن کا آغاز خوش گوار ہوتا ہے، بلکہ وہ ہیں جن کا انجام خوش گوار ہوتا ہے، گھوڑ دوڑ میں بازی اسی گھوڑے کے ہاتھ نہیں رہتی ہے جو آغاز پر سب سے آگے ہوتا ہے، بلکہ وہ ہیں جن کا انجام خوش گوار ہوتا ہے، جو خاتمہ پر سب سے آگے ہوتا ہے، فرعون اور نمرود، ہامان اور قارون اور قوم عاد وثمود سے زیادہ شاندار اور زیادہ بااقبال ''آغاز'' کس کا ہوا، لیکن ''انجام'' آخرت میں نہیں اسی دنیا میں جو کچھ ہوا ہے، اس کا تذکرہ بھی قرآن ہی میں محفوظ ہے، خوشحالی اور اقبال مندی کو لازمی طور پر اور ہر حال میں کسی قول کی ''اصلاح وفلاح'' کی دلیل قرار دینا، قرآن پاک کی تعلیم سے یکسر بیگانگی کا ثبوت دینا ہے۔''[۱]

اس مضمون کے ذریعہ مولانا عبدالماجد نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ، آغاز، کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ، ''انجام'' کی فکر کرنی چاہیے۔ اور یہ بھی واضح کیا کہ دینوی خوش حالی اور اقبال مندی مقبول الی اللہ ہونے کی علامت نہیں ہے۔

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۶۲، ۶۳

اہل اللہ سے اللہ کے واسطے جنگ

مسلم معاشرہ میں کئی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ان ہی خرابیوں میں سے ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم نے بزرگوں اور اکابروں کی پرستش شروع کی ہے۔ان کے اقوال و اعمال کو شرعی احکام کا درجہ دے رکھا ہے۔حالانکہ علم ایک الگ چیز ہے اور بزرگی ایک الگ چیز ہے۔مولانا عبدالماجد نے اس بحث میں سورۂ نمل کی آیات سے استدلال کیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے۔ایک مرتبہ سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ہدہد پرندے نے آ کر کہا کہ میں ایک ایسا علم لے کر آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں۔

مولانا نے یہاں بتایا کہ علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔یہاں ایک حقیر پرندہ وقت کے پیغمبر سے کہتا ہے کہ ''مجھے فلاں چیز معلوم ہے جو آپ کے علم میں نہیں'' اس پر نہ تو پیغمبر گرفت کرتے ہیں نہ قرآن ہی اس کی مذمت کرتا ہے۔علم خدا کی دین ہے کوئی بھی دعوی نہیں کرسکتا کہ وہ ہر حیثیت سے دوسروں سے افضل ہے۔

مولانا آگے لکھتے ہیں۔

> ''سلف سے حسن اعتقاد بے شک ایک اچھی چیز ہے اکابر کا احترام قطعاً لازم ہے لیکن اس تعظیم و احترام کو سلف پرستی کے درجہ تک پہنچا دینا، اکابر کو عملاً معصوم سمجھ لینا، اور بعد کے آنے والوں سے، پہلے گذر جانے والوں پر تنقید کا حق ہی سلب کر لینا، نہ مذہب کی تعلیم کے مطابق ہے نہ شہادت کے تجربے کے، نہ عقل کے موافق ہے نہ نقل کے۔''[۱]

یہ عقائد کی نازک بحث ہے۔مولانا کسی طرفداری کے بغیر ایک ایسی بات کو نمایاں کرتے ہیں جو تمام کے نزدیک مقبول ہے۔کیونکہ ان کے نزدیک اصلاح معاشرہ

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۳۰۲

مقصود تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر متقدم کا فعل متاخر کے لیے پتھر کی لکیر بن گیا ہے۔ اور آیت وحدیث کا حکم رکھنے لگا ہے' مفاسد پر مفاسد روزمرہ مشاہدہ میں آتے ہیں لیکن مجال نہیں کہ زبان ہل سکے کیوں کہ اس سے فلاں بزرگ پر اعتراض لازم آتا ہے، فلاں بزرگ کی تنقیص نکلتی ہے! بزرگوں کی تعظیم کیجیے یقینا کیجیے اکابر کے کسی قول یا فعل سے انکار کرنے میں جلدی ہر گز نہ کیجیے۔ خوب اچھی طرح غور وفکر کر لیجیے۔ ان کی شخصیتوں سے متعلق بہتر سے بہتر تاویل کر لیجیے۔ لیکن ان ساری احتیاطوں اور پیش بندیوں کے بعد بھی ان کی کوئی راہ خدا اور رسول کی راہ سے الگ اور اس کی مخالف نظر آئے تو آپ اپنی آنکھیں بھی بند کر لیجیے جو معصوم نہیں ہیں انہیں معصوموں کے درجہ پر نہ رکھے اور اللہ والوں سے اللہ ہی کے واسطے لڑ پڑیے!''[۱]

تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

مولانا عبدالماجد نے ایک کالم لکھا جس کا ہلال اکبری نے ''تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا'' عنوان باندھا ہے یہ مضمون خالص دعوت وتبلیغ پر اُبھرنے والا مضمون ہے۔ لیکن مضمون کا اسلوب ایسا دلچسپ ہے کہ قاری مسرت وبصیرت کے موتی سمیٹتا جاتا ہے۔

ہم ہندوستان میں رہتے ہیں۔ ہندوؤں کے رسم ورواج قریب سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی انہیں اسلام کی دعوت نہیں پہنچائی۔ ہم ان کے تہواروں پر اور ان کے پوجا پاٹ پر تنقید تو جی بھر کر کرتے ہیں۔ لیکن کبھی انھیں صدق دل سے سمجھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ مولانا عبدالماجد اس مضمون کا آغاز روایتی انداز سے دعوت وتبلیغ کی اہمیت

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۳۰۲، ۳۰۳

اُجاگر کرتے ہوئے خشک انداز میں نہیں کرتے بلکہ بڑے دلچسپ اور خوشگوار انداز میں، موسم گرما کی منظر نگاری سے کرتے ہیں۔

> ''جیٹھ کا مہینہ'' ہندی مہینوں میں گرم ترین مہینہ ہے اس چپتے ہوئے مہینے میں کبھی آپ کو لکھنو آنے کا اتفاق ہوا ہے؟ آفتاب کی تپش ہے کہ بھیجا پگھلائے دیتی ہے، لوکی لپٹیں ہیں کہ جسم کو جھلسائے رکھے دیتی ہیں۔ ہونٹ خشک، جسم پسینے میں شرابور، پانی کی طلب دم بدم، نہانے کی خواہش بار بار۔ اس عالم میں اور اس موسم میں آپ دیکھیں گے کہ آپ ہی جیسے انسان ایک دو نہیں۔ دس بیس نہیں، پچاسوں وار سینکڑوں جوان اور بوڑھے تنومند اور لاغر، بجز ایک بڑے لنگوٹ کے سارے جسم سے ننگ دھڑنگ اسی تپتی اور جلتی زمین پر سارے جسم کی درازی سے لیٹتے اور لوٹتے، میلوں اور کوسوں کے سفر کی مسافت طے کر رہے ہیں۔''[1]

دراصل موسم گرما میں ہندوؤں کا ایک تہوار ہوتا ہے۔ جس میں ہندو حضرات مہابیروں کی پوجا کرتے ہیں۔ مہابیر مقامی زبان میں بندر اور لنگور کو کہتے ہیں۔ لکھنو کے ایک محلہ علی گنج میں ایک خاص مندر ہ جہاں جوق در جوق زائرین جاتے ہیں، اور اپنی منتیں نذریں اُتارتے ہیں۔ زائرین گرمی کی پروا کئے بغیر لیٹ کر اور لوٹ کر راستہ طے کرتے ہیں اور نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ مہابیر سوامی کی جے! عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انسان بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مولانا اس پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یورپ کے مشرکوں نے کہا، کہ بندر انسان کا مورث اعلیٰ ہے، ہندوستان کے شرک نے ترقی کی جست اس سے بھی بڑھ کر لگائی، اور کہا کہ وہ تو ہمارا معبود ہے، ہمارا خدا ہے!

---

[1] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۲۶۷

ہندو حضرات کے افعال وحرکات پر ہم ہنس کر چپ ہو جاتے ہیں۔ کبھی انہیں دین کی طرف دعوت دینے کی فکر نہیں کرتے۔ لیکن جاننا چاہیے کہ یہی ہندو حضرات قیامت کے دن ہم سے سوال کریں گے کہ تمہارے پاس حق تھا تم نے ہم سے کیوں چھپایا؟ مولانا اپنے منفرد لب ولہجہ میں لکھتے ہیں۔

''آپ ہنسیں گے! اپنے مجمع میں بیٹھ کر ان عقیدوں کی ہنسی اُڑائیں گے لیکن موقع ہنسی کا نہیں، عبرت اور نصیحت کا ہے۔ دوسرے جس جہل اور جہل در جہل میں مبتلا ہیں ممکن ہے اس سے متعلق یہ عذر کسی درجہ میں پیش کر لیے جائیں، کہ ہم نے آنکھ کھول کر دیکھا بھی ہمارے کانوں میں آواز کبھی توحید کی پڑی ہی نہیں۔ لیکن ہم سے اور آپ سے جب یہ سوال ہوگا کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے عین تمہارے دروازوں پر تمہارے گلی کوچوں اور راستوں میں ہمارے ہزار ہا ہزار بندے ان جہالتوں میں پھنسے رہے، تم نے ان کو نکالنے کی کیا کیا کوششیں کیں؟ تمام امراض کے طبیب حاذق بنا کر بھیجے گئے تھے نسخہ شفا کو تم نے بڑی احتیاط سے اپنے تکیہ کے نیچے چھپا کر رکھ لیا، اور ان ہزاروں گرتے ہوؤں اور مرتے ہوؤں اور ڈوبتے ہووں کو بچانے کی کوشش خاک نہ کی۔ دوا زبردستی حلق کے نیچے اُتار دینا بے شک تمہارے بس میں نہ تھا، لیکن اس نسخہ کو تو گھر گھر پہنچا ہی سکتے تھے، تو فرمایئے! اس سوال کے وقت ہمارے اور آپ کے پاس کیا جواب ہوگا؟''[۱]

مولانا عبدالماجد اکثر مضمون کا اختتام سوالیہ نشان پر کرتے ہیں۔ ان کا یہ استفہامی انداز قاری کو سوچنے غور وفکر کرنے اور اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے۔

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۲۷۸

دشمنوں کے حقوق

عنوان نہایت چونکا والا ہے۔اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے سورۂ مائدہ آیت :۲،اور آیت: ۸ کو موضوع بحث بنایا ہے۔جس میں اس بات کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ دشمنوں پر زیادتی نہ کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔مولانا نے یہاں دشمنوں کے حقوق پر بحث کرنے کے بجائے اخبار کے حوالے سے گفتگو کے رخ کو اپنوں کے حقوق کی طرف موڑا ہے اور مسلمانوں کو دعوت فکر دی ہے کہ ان کا آپس میں سلوک کیسا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے جانی دشمنوں سے تک بہتر سلوک کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر مسلمانوں کا برتاؤ مسلمانوں سے کیا ہونا چاہیے؟ یہ بات غور طلب ہے۔اسی روشنی میں یہ طے ہونا چاہیے کہ ہمارے آپسی تعلقات کیسے ہوں۔

صحافی اپنے عصر کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔اس دور میں مسلمانوں میں اختلافات عروج پر تھے آج بھی مسلمان جماعتوں،فرقوں اور گرہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ایک جماعت دوسری جماعت سے برگشتہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے متنفر،ایک گروہ دوسرے گروہ سے نالاں۔حالانکہ سارے مسلمانوں کا خدا بھی ایک،رسول بھی ایک،کتاب بھی ایک اور قبلہ بھی ایک۔پھر آپس میں یہ رنجشیں کیا معنی! یہ داخلی انتشار کیا مطلب! مولانا عبدالماجد یہاں منطقی استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''مسلمانوں کی جماعتوں،گروہوں اور فرقوں کے آپسی تعلقات بھائیوں کے سے نہ سہی،عزیزوں کے سے نہ سہی،دوستوں کے سے نہ سہی کم سے کم مروت کی اس طرح پر تو ہونا چاہیے جو مسلمان کو دشمن سے روا رکھنا ضروری ہے۔ہر مسلمان اپنے بھائی مسلمان سے اس برتاؤ کا تو ضرور مستحق ہے جس کا حکم مسلمانوں کو اپنے دشمنوں اور کٹر دشمنوں کے ساتھ کرنے کو ملا ہے۔کیا آپ کا برتاؤ اس معیار پر بھی پورا

اُترتا ہے۔"[۱]

مولانا آخر میں افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جو برتاؤ دشمنوں کے ساتھ منع تھا، آج اس کے تختۂ مشق ہمارے ہی دوست ہمارے ہی عزیز ہمارے ہی بھائی ہمارے ہی ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں۔"[۲]

بے حیائی کے چرچے

مولانا عبدالماجد دریابادی کو قرآن کی روشنی میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کالم میں سورۂ نور کی (آیت:۱۹) کو پیش کر کے انہوں نے معاشرہ میں موجودہ بے حیائی کی تشہیر اور فحش نگاری کے فروغ پر بھرپور تنقید کی ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے "جولوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی باتوں کا چرچا رہتا ہے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

آیت میں "الفاحشة" کا لفظ آیا ہے۔ فحش کے معنی عربی میں بہت وسیع ہیں۔ فحش یفحش فحاشة کے لغوی معنی حد سے بڑھا ہوا ہونا۔ عربی کا مشہور شاعر امراء القیس کہتا ہے۔ جیدھا کجید الفاحشی گویا کہ اس کی گردن حد سے بڑھی ہوئی ہے۔" الفاحش فی القول کہتے ہیں بدکلامی کرنا۔ چنانچہ فحش کو فحش اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حد سے بڑھی ہوئی برائی ہوتی ہے۔ مولانا عبدالماجد نے یہاں اس لفظ کو وسعت پر زیادہ بحث نہیں کی۔ دراصل اس لفظ کی لغوی تحقیق ان کے پیش نظر تھی بھی نہیں۔ وہ اس لفظ کے معروف مسائل پر اظہار

---

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری "سچی باتیں" ص:۳۳

[۲] ایضاً ص:۳۳

خیال کرنا چاہتے تھے۔

قرآن انسان کی کمزور نبض پر ہاتھ رکھتا ہے۔ انسان کی یہ نفسیات ہوتی ہے کہ وہ برائی اور بے حیائی کی باتیں کرتے تھکتا نہیں۔ ہم چٹخارے لے لیکر بدکاریوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ فلاں عورت بدکار ہے۔ فلاں عورت بدچلن ہے۔ فلاں گھرانوں میں فلاں فلاں شرمناک واقعات پیش آچکے ہیں۔

زبان سے کسی برائی کا تذکرہ کرنا ہی بے حیائی کی تشہیر کرنا نہیں ہے بلکہ (**ولا تعاونوا علی الأثم والعدوان** کی روسے) بے حیائی کے فروغ میں حصہ لینا اور فحش میں کسی بھی قسم کا تعاون موجب گناہ ہے۔ چنانچہ اسی بات کے پیش نظر مولانا عبدالماجد نے ''صحافت کی اخلاقیات'' کو موضوع بنایا ہے اور اخبارات کی فحش نگار کو ہدف طنز بنایا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں طنز وظرافت کے عناصر بھی ہیں۔ اقتباس پیش ہے۔

> ''اشخاص وافراد کو بھی چھوڑیئے کاغذ کے ان لمبے لمبے ورقوں کو دیکھیے جو ہر روز قوم کی خدمت اور اصلاح ملت کے دعووں کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے ہیں! کوئی بداخلاقی، کوئی بے حیائی کوئی بدکاری ایسی بچ رہتی ہے، جو بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ مزے لے لے کر نہ بیان کی جاتی اور نہ پھیلائی جاتی ہو؟ ہر روزنامہ کے اندر ہر روز لازمی طور پر ایک کالم ظرافت وخوش طبعی کا ہوتا ہے اور خوش طبعی کے معنی ان بزرگوں نے یہ لے رکھے ہیں کہ کسی کی عزت وآبرو محفوظ نہ رہے اور ہر قسم کی فحش نویسی کو شریف گھرانوں کے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں تک بلاتکلف پہنچادیا جائے اور آج سب سے زیادہ ''کامیاب'' وہی روزنامہ ہے جس کا ظریفانہ کالم فحش نویسی میں سب سے زیادہ بیباک ہے اور پھر اگر کوئی شرمناک مقدمہ اتفاق سے کسی عدالت میں چلنے لگے تو وہاں کے روزناموں کی گویا قسمت جاگ اُٹھتی ہے! کیسے کیسے چٹپٹے اور شوق

> انگیز عنوانات دیے جاتے ہیں، کیسی کیسی مزیدار حاشیہ آرائیاں کی جاتی ہیں، اور قرآن جو ''آج'' خاموش ہے مگر ''کل'' اظہار کے وقت خاموش نہیں رہے گا، خاموش کے ساتھ کے یہ سارے کرتوت دیکھتا رہے گا۔''[۱]

مذکورہ اقتباس کے واوین میں ''آج'' اور ''کل'' کا لفظ معنی خیز علامت ہے۔ آج سے مراد دنیا اور کل سے مراد آخرت ہے۔ جیسا کہ قرآنی آیت سے ظاہر ہے۔

متذکرہ بالا اقتباس میں مولانا نے جہاں صحافت میں اخلاقیات پر زور دیا ہے وہیں یہ بھی بتایا ہے کہ صحافت کا پیشہ اس لیے اختیار نہیں کیا جاتا کہ آزادئ اظہار کے نام پر دوسروں کی عزت و آبرو سے کھیلا جائے اور ان کی برائیوں کا برملا اظہار کیا جائے۔ مولانا کا یہ اقتباس ایسے صحافیوں کے لیے لمحۂ فکر ہے، اور صحافت کی تہذیب پیش کرتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے کالمس ''سچی باتیں'' کا ایک اور انتخاب مولانا عبدالماجد دریابادی کے نواسے مولانا نعیم الرحمن صدیقی ندوی نے بھی ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کو اکتوبر ۲۰۰۱ء میں خود نعیم الرحمن صدیقی ندوی نے شائع کیا۔ کتاب کے اولین صفحات پر ایک پر مغز اور وقیع مقدمہ ''عرض مرتب'' کے نام سے تحریر ہے۔ نعیم الرحمن صاحب نے اس مقدمہ میں بہت سی پتے کی باتیں بتائی ہیں۔ اس کتاب میں 98 کالمس ہیں جن میں سات (۷) کالم وہ ہیں جو عبدالماجد نے اپنی عمر کے 75,70,65,60,50,40 اور 80 ویں سال کی تکمیل پر قلم بند کیے۔ باقی کالم مختلف موضوعات پر ہیں۔ موضوعات کے کم پیش یکسانیت کے سبب ان مضامین پر صرف سلسلہ وار نمبر ڈال دیا گیا ہے اور سرخیاں لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ اس انتخاب میں بھی کالموں کے حوالہ جات درج نہیں ہیں۔ ہاں ''عرض مرتب'' میں یہ بات بتائی کہ یہ انتخاب ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک کے اخبار

[۱] عبدالماجد دریابادی مرتب: ہلال اکبری ''سچی باتیں'' ص: ۴۳

سچی باتوں کے کالموں پر مشتمل ہے۔ جن میں توحید کی دعوت، سیرت پاک صحابہؓ کے واقعات، معاشرہ کی اصلاح وتربیت جیسے مفید اور کارآمد مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب نعیم الرحمن صدیقی صاحب کے انتخاب کی پہلی جلد ہے۔ ان کا کہنا ہے۔

> ''اگر رب کریم کی توفیق کی ارزانی ہوئی اور قارئین کرام کی حوصلہ افزائی ہوئی تو انشاء اللہ ''سچی باتیں'' کی مزید جلدیں پیش کی جائیں گی۔'' [۱]

عرض مرتب کے بعد پیش لفظ عبدالعلیم قدوائی صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''مولانا عبدالماجد ان کالموں کے ذریعہ معرفت، حکمت، موعظت کے موتی سلیس اور شگفتہ زبان میں بکھیرتے تھے۔ عرصہ سے شائقین علم وادب کا تقاضا تھا کہ سچی باتوں کی کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔''[۲]

ذیل کی سطور میں مولانا عبدالماجد کے چند منتخب کالموں پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان کی صحافتی تحریروں کی قدر وقیمت متعین کی جاسکے۔

حج وقربانی کی حقیقت

مولانا عبدالماجد دریابادی حالت حاضرہ اور سال کے مہینوں کی مناسبت سے کالم لکھتے تھے۔ ربیع الاول کا مہینہ آتا تو، میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتے، رمضان کا مہینہ آتا تو روزہ کے بارے میں لکھتے، محرم کا مہینہ آتا تو محرم کے فضائل وبرکات کے بارے

---

[۱] عبدالماجد دریابادی، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ندوی ''سچی باتیں'' ص: ۷

[۲] ایضاً ص: ۲۹

میں تحریر کرتے۔اسی طرح حج کا موسم ہو، تو ان کا کالم حج وقربانی کے متعلق ہوتا۔ حج و زیارت کی روح پرور عبارتوں کی بابت مختلف ادیبوں نے مختلف پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔مولانا کے انداز بیان کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

''حج کا موسم آ گیا، دیار حبیبؐ کی زیارت کی گھڑی آ گئی، دیوانوں کے جوش جنون کے تازہ ہونے کا زمانہ آن لگا، بچھڑے ہوؤں کے ملنے کا وقت آ پہنچا، جن جن کے نصیب میں تھا، وہ باوجود ہر طرح کے بے سروسامانی کے، اپنے دور دراز وطن سے چل کر سخت گرمی کے موسم میں طویل سفر کی کلفتیں اٹھا کر، عرب کے تمتماتے ہوئے آفتاب، حجاز کی جھلسا دینے والی لو، ریگستان کی تپتی ہوئی زمین کو برداشت کرتے، امیر وغریب، لاکھوں کی تعداد میں سب ایک ہی قسم کا لباس پہنے، سب ایک ہی چادر اوڑھے ایک ہی تہبند باندھے، اپنے ایک ہی پیارے کی یاد میں اپنے ایک ہی دلارے کی دھن میں، اسی کا نام جپتے، اسی کی بڑائی پکارتے سعی وطواف حج وزیارت میں مشغول ہیں''۔ [۱]

حج بیت اللہ کی آرزو ہر مسلمان کو ہوتی ہے لیکن سفر کے اخراجات ہر ایک کو اجازت نہیں دیتے کہ اس آرزو کی تکمیل کرے۔ایسے لوگوں کو مولانا عبدالماجد تسلی دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اگر طلب صادق رکھنے کے باوجود اب کے سال حاضری کی سعادت آپ نہ حاصل کر سکے، تو زیادہ غم نہ کیجئے، کم از کم اپنی بستی میں تو اپنے ایمانی بھائیوں کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے رب کعبہ کے آگے اپنا سر بہر حال جھکا ہی سکتے ہیں۔اور اپنے مکان پر رہ کر لا مکان

[۱] ''صدق جدید'' ہفتہ وار ۲۴/مارچ ۱۹۷۲ء ص:۱

کے مکین کے بڑائیاں تو شب و روز پکار ہی سکتے ہیں"۔[۱]

ہم مسلمان قربانی تو کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کی حقیقت ایک رسم سے زیادہ کچھ نہیں۔ ابراہیم خلیل اللہ کی قربانی اور ہماری قربانی میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہماری قربانی خلیل اللہ کی قربانی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ مولانا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جذبہ قربانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میری زندگی اور میری موت، سب کچھ پروردگار عالم ہی کے لیے ہے، یہ اس کا قول تھا۔ اپنی پیاری اولاد کو خدا کی راہ میں چھری کے نیچے لے آنا، یہ اس کا عمل تھا۔ آپ کا عمل اس عمل سے کوئی مناسبت رکھتا ہے؟ ایک مسلم وہ تھا، جو اولاد کے حلق پر چھری پھیر رہا تھا۔ ایک مسلم آپ ہیں کہ جب آپ سے کہا جاتا ہے کہ اپنی اولاد کو بجائے فرنگی قالب میں ڈھالنے کے خدمت دین کے لیے تیار کیجئے تو آپ ایسی تجویز کو تمسخر کے قابل سمجھتے ہیں؟ پھر آپ کو کوئی حق ہے، کہ آپ بھی اپنی قربانیوں کو مقبول ہونے کی کوئی توقع قائم کر سکیں؟"[۲]

مندرجہ بالا اقتباس میں مولانا "فرنگی قالب" کا ذکر کیا ہے۔ دراصل وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہماری قوم تیزی سے انگریزوں کے رنگ میں رنگتی جارہی ہے۔ اسلامی تعلیمات سے روگردانی کر کے مغربی تہذیب و کلچر کو اپناتی جارہی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مغربی تہذیب کے رمز شناس تھے وہ اس کی کمزوریوں سے خوف واقف تھے۔ وہ امت مسلمہ کو اس کے نقصانات سے بچانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے عید قربان کے موضوع پر لکھے جانے والے اس کالم کو لوگوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے کے لیے استعمال کیا۔

---

[۱] عبدالماجد دریابادی، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ندوی "سچی باتیں" ص:۷
[۲] ایضاً ص:۵۰

احتساب

مولانا عبدالماجد دریابادی انسانی نفسیات سے خوب واقف تھے۔انہوں نے اردو زبان میں نفسیات کے ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔نفسیات ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ چنانچہ اس ہتھیار کے ذریعہ قاری پر اثر انداز ہوتے تھے۔اسلوب اور طرز بیان میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ قاری کو کس طرح متاثر کیا جائے۔کونسا حربہ کارگر ہوسکتا ہے جس سے قاری کے ذہن پر حملہ کرکے اس کے فکر و مزاج کو منقلب کیا جا سکے۔

اسی بات کے پیش نظر وہ اکثر استفہامی اور مخاطبی انداز بیان اختیار کرتے ہیں جس کے اندر طنز کے تیز بھی ہوتے ہیں،اور ظرافت کی پھول جھڑیاں بھی۔مثلاً مولانا عبدالماجد پیش نظر کالم میں ماہ ربیع الاول کے گذر جانے کے بعد مسلمانوں کو خود احتسابی کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ذرا آیئے ہم اور آپ مل کر خود اپنا اپنا حساب لیں۔ہمارے سرور سردار ﷺ نمازیں بہت کثرت سے پڑھتے تھے،ہم نے اس مہینہ میں کوئی نماز ترک تو نہیں کی؟ فرض نمازوں کے علاوہ وہ نماز تہجد پابندی و اہتمام کے ساتھ پڑھتے تھے،ہم نے بھی سنتوں اور نفلوں کی پابندی پر کچھ توجہ کی؟ ان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز نماز تھی،ہم نے بھی کچھ ذوق ان سے پیدا کیا؟ وہ نماز اس طرح ادا فرماتے تھے کہ گویا پروردگار کے بالکل سامنا ہے،ہم کو نماز پڑھتے ہوئے کچھ دھندلا سا تصور بھی اس طرح کا پیدا ہوا؟ ان کو حالت نماز میں گریہ و بکا ہوتا تھا،ہماری آنکھیں بھی خشیت الٰہی سے کبھی نم ہوئیں؟''[۱]

---

[۱] عبدالماجد دریابادی،مرتب:نعیم الرحمن صدیقی ندوی ''سچی باتیں'' ص:۳۰

> ’’ماہ مبارک ربیع الاول میں ظاہر ہونے والا ہمارا سردار وآقا دوسروں سے کام لینے کے بجائے خود دوسروں کے کام کر دیا کرتا تھا، ہم کو بھی ایسی توفیق کبھی نصیب ہوئی؟ حضورؐ سب سے نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، ہم نے بھی اپنا برتاؤ ایسا رکھا؟ وہ دوست ودشمن اپنے اور بیگانے سب کی خدمت کرنے والے تھے، ہم نے رحمت عالم کی پیروی کی کچھ بھی کوشش کی؟ وہ ہمیشہ کم کھاتے اور بعض اوقات فاقہ بھی فرماتے تھے، ہم بھی اپنی بھوک اور اپنی زبان کے چٹخارے کو اپنے قابو میں لا سکے ہیں؟ وہ غریبوں سے میل جول رکھنا پسند فرماتے تھے، ہم کو غریبوں سے زیادہ ملنے میں کچھ تامل تو نہیں ہوتا؟ روپیہ پیسہ کی فکر ان کے پاس تک نہ آئی تھی، اپنے تئیں روپیہ پیسہ کی فکروں سے کچھ آزاد کر سکے ہیں؟‘‘[۱]

پورا مضمون اسی طرح استفہامی انداز پر مشتمل ہے۔ جو قاری کو راست متاثر کرتا ہے۔ ان سوالات کی بوچھا کو قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مولانا اس انداز سے مسلمانوں کو عمل پر اُبھرنا چاہتے ہیں۔ عملی طور پر مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ اسوۂ رسول ﷺ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں بھی یہی انداز اپنی بھرپور تاثیر کے ساتھ موجود ہے۔

> ’’اگر ہم نے ان میں سے کسی چیز پر توجہ نہیں کی تو ہمارے لیے ربیع الاول کا آنا اور نہ آنا یکساں رہا۔ ہمارے لیے سرور عالم ﷺ کا ظہور بیکار رہا۔ ہمارے لیے آفتاب ہدایت کا طلوع لاحاصل ہی رہا۔ بارش ہوئی اور ہم نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے؟ اس کی بابت سوال خود ہم ہی

---

[۱] عبدالماجد دریابادی، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ندوی ’’سچی باتیں‘‘ ص: ۳۰

> سے ہوگا یا کسی اور سے؟ پھر جس وقت ہم سے یہ سوالات ہوں گے اس
> وقت کے لیے کوئی معقول جواب ہمارے پاس ہے؟ اس وقت ہمارا
> کوئی عذر کام دے سکے گا؟"[۱]

پورا مضمون پڑھ لیجیے۔ استدلال و استشہاد ہے نہ علم و معرفت کی باتیں۔ حکمت و موعظمت ہے نہ تذکیر و عرفان کے موتی۔ وہی چھوٹی چھوٹی باتیں جسے ہم سب جانتے ہیں۔ وہی عام اور مشہور باتیں جسے روز آنہ ہم سب سنتے ہیں۔ لیکن انداز بیاں دلوں کو چھونے والا، دماغ کو جھنجھوڑنے والا۔ بات چھوٹی اور معمولی سہی لیکن قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ اور میرے اعمال کیسے ہیں؟ نصیحت اور تزکیہ کا یہ انداز مولانا عبدالماجد کا منفرد انداز ہے۔

ماڈرن حج:

مولانا عبدالماجد دریابادی چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھی درس عبرت لیتے ہیں۔ اور لوگوں کی عام نفسیات کا قریب سے مطالعہ کرکے ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ "سچی باتیں" کے ایک کالم میں اسی طرح نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "بھئی دو گھڑیاں تو میرے لیے ضرور ہی لانا"۔
>
> اور کہیں میری فرمائش نہ بھول جایئے گا، ایک اچھے ریڈیو سٹ کی،
> خیر اور کسی کی فرمائش آپ لائیں یا نہ لائیں۔ میری فرمائش تو آپ
> نے نوٹ بک میں ضرور ہی درج کرلی ہوگی۔ وہی دو ریشمی قالینوں
> کی۔"[۲]

---

[۱] عبدالماجد دریابادی، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ندوی "سچی باتیں" ص:۴۹

[۲] ہفتہ وار صدق جدید ۱۷ رجون ۱۹۶۰ء ص:۱

دراصل یہ فرمائشیں ایک عازم حج سے کی جارہی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"یہ تابڑتوڑ فرمائشیں، عزیزوں اور دوستوں کی طرف سے ایک عازم سفر سے ہورہی تھیں۔ سفر کہاں کا؟ کسی بڑی نمائش یا میلے کا؟ ملک کے اندر یا باہر کسی بڑے تجارتی شہر کا؟ جی نہیں ایک عازم سفر حج سے۔ ایک ہونے والے حاجی سے۔ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ طیبہ کرنے والے سے۔" [۱]

مولانا ان فرمائش پر افسوس کرتے ہیں اور بڑے انوکھے انداز سے اپنے تاسف کا اظہار کرتے ہیں:

"گئے وہ دن جب حاجیوں سے درخواستیں اس قسم کی کی جاتی تھیں کہ "للہ غلاف کعبہ پکڑ کر میرے حق میں دعائے خیر کرنا۔ عرفات میں اور منیٰ میں اس گنہگار کو یاد رکھنا۔ حطیم میں اور ملتزم میں اس عاصی پُر معاصی کے لیے دعائے مغفرت کر دینا۔ روضہ نبویؐ پر یہ ادب تمام سلام اس ننگ اُمت کا پہنچا دینا۔ اور تمنائے حاضری عرض کر دینا"۔

یا فرمائشیں اگر کی بھی جاتی تھیں۔ وہ تبرکات حجاز کی۔ آب زمزم کی شیشیوں کی، مدینہ منورہ کی جھجوروں کی، غلاف کعبہ کے ٹکڑوں کی، وغیرہا۔ وہ حج تھا۔ اور اب "ماڈرن حج" ہے۔ اس دور میں وہاں کی مٹی تک بابرکت اور "خاک شفا" تھی۔ اب جدہ ہو یا مکہ ان کی حیثیت صرف ماڈرن شہروں کی رہ گئی ہے۔ جہاں امریکا اور یورپ کی بنی ہوئی چیزیں ارزاں سے ارزاں قیمت پر خریدی جاسکتی ہے اور آسانی سے ہندوستان و پاکستان درآمد کی جاسکتی ہیں! بلکہ بعض اللہ کے بندوں نے تو حج سالانہ کے نام سے یہی مستقل پیشہ درآمد برآمد کا

---

[۱] ہفتہ وار صدق جدید ۱۷ر جون ۱۹۶۰ء ص:۱

> اختیار کرلیا ہے۔ قرآن مجید تو مشرکوں کے حق میں کہا تھا کہ کیا خوب قدر کی ہے ان لوگوں نے اللہ کی! اور اب مسلمان ہیں کہ کیا خوب قدر کر رہے ہیں، ۔اللہ کے گھر اور اس کے طواف کی اور رسول ﷺ کے مرقد اور اس کی زیارت کی![1]

قاری مولانا کا یہ اقتباس پڑھنے کے بعد سوچنے لگتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا کر رہا ہوں، دل محسوس کرنے لگتا ہے کہ واقعی میں تاریکی میں پڑھ رہا تھا۔ اور حقیقی روشنی تو کچھ اور ہے۔

اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں

ہندوپاک کی تقسیم کے بعد سے ہندوستان میں اردو زبان سے تعصبیت برتا جا رہا ہے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اردو کی اہمیت کو گھٹایا جا رہا ہے۔ حکومت کے ہر شعبہ اور ہر ادارے میں اردو کو نکل باہر کیا جا رہا ہے۔ اس پس منظر میں مولانا عبدالماجد اپنے کالم میں تاریخ سے ایسی مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ اردو زبان صرف مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ ماضی میں ہندو بھی اس زبان کے قدردان تھے اور حال میں بھی۔ مولانا اپنے منفرد اور دلنشین استفہامیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> وہ زمانہ (آج سے سوا سو سال قبل تو خیر لکھنو میں مسلم حکومت اور اردو تہذیب وثقافت کا تھا اس وقت اردو مثنویوں سی اور کس کی چمکی تھی؟ گلزار نسیم، کشمیری پنڈت دیا شنکر نسیم کی کہی ہوئی۔ اس کے بعد اردو کا پہلا ناول نویس ان سب سے زیادہ مشہور ومقبول ایک دوسرے کشمیری پنڈت رتن ناتھ سرشار صاحب فسانہ آزاد۔
>
> اور پھر آج اس گروی کے دور میں عین اردو بیزاری کے عروج وشباب

[1] ہفتہ وار صدق جدید ۱۷ جون ۱۹۶۰ء ص:۱

> میں اردو کے دو مشہور ترین شاعر کون ہیں؟ ایک فراق گورکھپوری اور دوسرے کشمیری پنڈت آنند نرائن ملا۔ اور مرکزی ادارہ اردو کے صدر کون رہے ہیں؟ ایک پنڈت تیج بہادر سپرد اور اب ان کے جانشین پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ اور ساٹھ برس کی مدت تک اردو صحافت کی نمائندگی یعنی منشی نول کشور اور ان کے خاندان والے اور ایڈیٹر بھی مدتوں ہندو ہی رہا کیے۔ اور اردو کا سب سے بڑا پبلیشر بھی اس سے زیادہ مدت تک کون رہا ایک ہندو منشی نولکشور، واہ رہی اردو، اور تیری قسمت! تیرے خلاف تعصب اور دشمنی کی گھنگھور گھٹا اور دوسری طرف تیری سخت جانی تیرے مخلصوں کی خدمت گزاری اور تیرے جلووں کی تابکاری اور تاب واری''۔[1]

اس اقتباس میں مولانا کا انداز بیان اسلوبیات میں یہ ایک نیا اضافہ ہے۔ مولانا خود ہی سوالات کرتے جا رہے ہیں اور خود ہی جواب دیتے جا رہے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے تاریخی دلائل سے سمجھانے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ بلکہ سادہ اور آسان انداز میں قاری کو یہ بات ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ آخری کا یہ جملہ ''واہ ری اردو اور تیری قسمت! تیرے خلاف تعصب اور دشمنی کی گھنگھور گھٹا اور دوسری طرف تیری سخت جانی تیرے مخلصوں کی خدمت گزاری اور تیرے جلوؤں کی تابکاری اور تاب واری!'' غصب کا طنز ہے۔

[1] عبدالماجد دریابادی، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ندوی ''سچی باتیں'' ص:۴۹

عبدالماجد دریابادی کی صحافت کا اسلوب

عبدالماجد درآبادی کی صحافت کا اسلوب

پچھلے ابواب میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے صحافت اوران کی کالم نگاری کا جائزہ بالتفصیل لیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ جائزہ اس وقت تک ناممکن رہے گا جب تک مولانا عبدالماجد کے مختلف النوع تحریروں کا خصوصاًان کی تحریر کے اسالیب کا جائزہ نہ لیا جائے۔ یہ جائزہ اس اعتبار سے بھی نہایت ضروری ہے کہ کسی بھی نثر پارے یا نظم پارے کی تاثیر میں جتنا حصہ مفہوم وخیال کا ہوتا ہے اتنا ہی اسلوب کا بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلوب پر مختصر گفتگو کر کے مولانا دریابادی کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے گا۔

اسلوب کے معنی او مفہوم

اسلوب کے معنی اندازِ کلام، انداز بیان، انداز تحریر، طرز کلام، طرز بیان، طرز تحریر وغیرہ کے ہیں۔ اردو تنقید میں لہجہ، رنگ اور رنگ سخن وغیرہ اصطلاحیں بھی اسلوب یا اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کے انداز بیان کے خصائص کیا ہیں؟ یا کس صنف یا ہئیت میں کی زبان استعمال ہوئی یا کس عہد میں زبان کیسی تھی اور اس کے خصائص کیا تھے، وغیرہ یہ سب اسلوب کے مباحث ہیں۔ بقول

پروفیسر گوپی چند نارنگ ''ادب کی کوئی پہچان اسلوب کے بغیر مکمل نہیں'' [۱]

اسلوب یا طرز نگارش کے مسئلے پر کوئی دوٹوٹ یا فیصلہ کن بات کہنا آسان نہیں ہے۔ آسان لفظوں میں یہ افکار وخیالات کے اظہار وابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشین بھی ہو اور منفرد بھی۔ اسی کو انگریزی میں Style کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے طرز یا اسلوب کا لفظ مستعمل ہے۔ اسلوب عربی لفظ ہے۔ یہ طریقہ راستہ روش اور ڈھنگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں۔

> ''یہ فی الاصل کسی متعین ومتقین روش کے لیے ہے۔ اسی لیے جب عربی میں کہتے ہیں ''انفہ فی اسلوب'' یعنی اس کی ناک ایک ہی ڈھنگ سے رہتی ہے (یا وہ مغرور ومتکبر ہے) تو اس میں انفرادیت کا تصور بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ادب میں کسی کے مخصوص انداز نگارش کے واسطے بولا جاتا ہے جس میں لکھنے والے کی شخصیت کے منفرد خدوخال نظر آئیں'' [۲]

اسلوب یا Style کی مختلف دانشوروں نے مختلف تعریف کی ہے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور قول ڈاکٹر بوفان Buffon کا ہے وہ کہتا ہے۔

"Le Style est I' Home Meme"

یعنی اسلوب خود انسان ہے'' [۳]

---

[۱] پروفیسر گوپی چند نارنگ ''اسلوب اور اسلوبیات''، مشمولہ، تنقیدی مضامین، مرتبہ پروفیسر فضل الحق ص: ۱۸۳

[۲] پروفیسر نثار احمد فاروقی ''اسلوب کیا ہے؟ مشمولہ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید، مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی ص: ۱۴۳

[۳] ایضاً ص: ۱۴۵

اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ مصنف کی شخصیت اپنے تمام پہلوؤں اور رنگ و آہنگ کے ساتھ تحریر میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ہر اچھے نثری اسلوب میں شخصیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لکھنے والا اپنی افکار کو ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ الفاظ کی موزوں و مناسب ترتیب کے ساتھ ذاتی نقطہ نظر کے اظہار سے اس کی شخصیت کی افتادہ کا بھی پتہ چل سکے اس سے واقعات کی بھرپور عکاسی بھی ہوتی ہے اور اس کے بیان سے جذبہ کی گرمی اور احساس کے خلوص کا بھی علم ہوتا ہے۔

مڈلٹن مرے نے The Problem of style میں انداز بیان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''بہتر اسلوب وہی ہوگا جس کا عمل موضوع کی معنویت میں زیادہ ڈوبا ہوا ہو۔ یعنی اچھا اسلوب اچھے موضوع کا عکاس ہوتا ہے۔ گراہم ہف Graham Haff نے اسٹائل کو فن کار کے لباس سے تعبیر کیا ہے جس میں فن کار اپنے مخصوص خدوخال ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Style and Stydistics میں کہتا ہے کہ زبان خیال کا لباس ہے اور اسلوب اس لباس کی مخصوص تراش خراش اور وضع ہے۔[1]

اردو کے صاحب طرز ادیب اور عبدالماجد دریابادی

جب ہم اردو نثر کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جن انشاء پردازوں نے اپنے اسلوب کے دوامی نقوش چھوڑے ان میں ملا وجہی، میر امن، رجب علی بیگ سرور، غالب، محمد حسین آزاد، شبلی، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ ساتھ عبدالماجد دریابادی کا نام بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جن کے انداز نگارش کا ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سیدہ جعفر، محک اور مہک، ص: ۲۱۹

مولانا دریابادی کی صحافتی عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ ہے۔ جب انہوں نے اس وادی میں قدم رکھا اُس وقت اردو کے نثری اسالیب کے افق پر پانچ صاحب طرز ادیب سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ تمام مصنفین ان کی تقلید کرنے کو باعث افتخار سمجھتے تھے۔

اس دور کے گذر جانے کے بعد ادیبوں اور نقادوں کا ایک طویل سلسلہ چلتا ہے۔ اردو میں اسالیب نثر کی طویل تاریخ میں بعض حالؔی کے ترجمان ہیں تو بعض شبلی کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، رسوا، حسن نظامی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، نیاز فتح پوری، سجاد علی انصاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سجاد حیدر یلدرم، خورشید الاسلام اور انتظار حسین وغیرہ بھی اپنے منفرد اسلوب سے دنیائے اردو کو مسحور کرتے رہے۔ یہ اردو کے وہ نثر نگار تھے جنہوں نے تخیلی اور تخلیقی نثر کے ان گوشوں کو منور کیا جنہیں صاحب طرز ادباء کے اثر سے قبول کیا تھا تو دوسری طرف مغربی ادب سے بھی استفادہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک کا لہجہ الگ، ہر ایک کا طرز جدا، ہر ایک کا رنگ مختلف تھا۔ جو انہیں کے ساتھ مخصوص تھا۔

عبدالماجد دریابادی کے سامنے یہی نمونے تھے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عبدالماجد دریابادی نے اس میں سے کسی کا تتبع کیا تھا؟ اس سلسلہ میں ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہر ادیب اپنے ابتدائی دور میں کسی نہ کسی پیش رو کا تتبع کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تحریر پر پیش رو کا رنگ مغلوب اور اپنا اصلی رنگ غالب آتا جاتا ہے۔ آخر کار وہی رنگ اس کی پہچان اور اس کی انفرادیت بن جاتی ہے۔ یہی بات مولانا عبدالماجد کے تعلق سے بھی اہم کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ابتدائی دور میں شبلی اور اکبرالہ آبادی کے اسلوب کے پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر بہت جلد ایک منفرد اسلوب اختیار کر لیتے ییہں جس کے موجد بھی وہی ہیں اور خاتم بھی وہی ہے۔ اس سلسلہ میں عبدالماجد دریابادی کے داماد حکیم عبدالقوی

دریابادی لکھتے ہیں۔

''مولانا کا طرز تحریر، ان کے دور فلسفیت میں ایک حد تک موالانا شبلی مرحوم کے تتبع کو ظاہر کرتا تھا۔ اب ان کا طرز پہلے سے بالکل مختلف ہو چکا ہے۔ بے ساختگی، سادگی، شدت، تاثر، رعایت لفظی کا وقتاً فوقتاً استعمال، لیکن اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ ذرا بھی آورد نہ معلوم ہو۔ مضمون کے لحاظ سے موزوں الفاظ اور فقروں کا انتخاب، ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں۔''[۱]

مشہور نقاد احتشام حسین ان کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بہت ممکن ہے کہ ابتداء میں انہوں نے آزاد اور شبلی کا رنگ پسند کیا ہو، مہدی افادی، حسن نظامی، سلیمان ندوی نے متوجہ کیا ہو، رسکن اسکر وائلڈ والٹر پیٹر کے اسلوب نے گدگدی پیدا کی ہو، لیکن شروع ہی سے ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور طرز اظہار میں کوئی ایسی بات ضرور ملتی ہے جو خود انہیں کی ہے اگر کسی جملہ کی ساخت مولانا محمد حسین آزاد سے مل جاتی ہے تو تحریر کا دوسرا حصہ شبلی کی یاد دلاتا ہے اور تیسرے میں ابو الکلام آزاد کی خطابت جھلکتی ہے اور طنز و کا نشتر دلوں میں دور تک اُترتا دکھائی دیتا ہے پھر جب مکمل تحریر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنا تاثر ایک امتیازی اور انفرادی اسلوب کی حیثیت سے چھوڑتی ہے۔ ہر دوسرے ادیب سے مختلف اور ہر تنقیدی اسلوب سے الگ۔''[۲]

مولانا عبدالماجد کے اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پیچیدہ اور گہرے

---

[۱] حکیم عبدالقوی دریابادی ماہنامہ نقوش، شخصیات نمبر ص: ۲۶۳

[۲] پروفیسر احتشام حسین 'مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت، ماہنامہ فروغ اردو لکھنو ''ماجد نمبر'' اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۹۹

فلسفیانہ حقائق کو بھی بڑی سادگی اور بے تکلفی سے پیش کر دیتے ہیں، ان کی طرز نگارش فلسفیانہ حقائق اور دقیق بحثوں کو پیش کرتے وقت بھی بوجھل اور ثقیل نہیں ہوتی۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں۔

''مولانا عبدالماجد عربی اور فارسی کے عالم ہیں فلسفہ اور نفسیات کے ادق مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن ان کے اسلوب میں دشوار پسندی اور غربات بیان کا شائبہ بھی نہیں۔ اخباروں کی خبروں پر حاشیہ آرائی ہو کسی بڑے آدمی پر نکتہ چینی ہو، کسی کانفرنس کا اجتماعی کے لیے چند سطروں کا پیام ہو، کسی مشہور ادیب کی تخلیق پر تبصرہ ہو، کوئی معمولی ادبی لطیفہ، یا چٹکلا ہو، مولانا کے قلم سے چھو کر رنگین اور شگفتہ بن جاتا ہے۔ اسلوب کی یہی ادبیت ہے جو کسی منزل پر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی معاصرانہ چشمکوں میں بھی اسلوب اپنی سادگی اور وقار کے ساتھ تیر و نشتر بنتا ہے اور تعزیت کے پیغاموں میں آنسو اور مرہم، سفرناموں اور ڈائریوں میں، اسی سے مصوری ہوتی ہے اور مذہبی مقالات میں عقیدے کی گرمی سے تابناکی پیدا ہوتی ہے۔''[۱]

جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوب کی بات ہے۔ اس سے پہلے مڈلٹن مرے کی بات ذہن میں رہنی چاہیے جیسا کہ اس نے پہلے ذکر کیا گیا۔

''بہترین اسلوب وہی ہے جو صاحب قلم موضوع کی معنویت میں اتنا سرشار ہو کہ اسے یہ خیال بھی نہ گذرے کہ میں کوئی اسلوب تخلیق کر رہا ہوں۔ بس یہی متقضائے حال کا دباؤ ہے۔ جس کے زور سے اسلوب ادا کے اجزاء خود بخود موقع و مقام کے مطابق ڈھلے چلے جاتے ہیں۔

[۱] پروفیسر احتشام حسین 'مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت، ماہنامہ فروغ اردو لکھنو'' ماجد نمبر'' اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۹۷

واضح ہو کہ سادگی و رنگینی وقت سلاست اور تکلف و بے تکلفی وہ اضافی
اجزاء میں جو معنویت اور مقتضائے حال کے اپنے اپنے مقام پر آتے
ہیں۔"[۱]

مڈلٹن کی یہ بات مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں پر صد فیصد صادق آتی ہے۔
انہوں نے جس موضوع پر بھی لکھا دل کی گہرائیوں سے لکھا۔

اسلوب کو شخصیت کا پرتو بھی کہا گیا ہے۔ اس پہلو سے ہم دیکھتے ہیں تو مولانا کی مذہبی
شخصیت ان کی ہر تحریر میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ لہجے کی شگفتگی اور خیال کی یہی
مقصدیت ہے جو مولانا عبدالماجد کو منفرد طرز نگارش کا اہل بنا دیتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافت میں مقصدیت کے رچاؤ کو ہم "برگ گل
میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم" سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا، لیکن اس مقصدی لگن میں بھی
لطافت اور شگفتگی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اپنی بات کو استدلال، منطقی ربط اور
پورے اعتماد کے ساتھ پیش کر کے غیر محسوس طور پر قاری کے شعور کو اپنی گرفت میں لے لیتے
ہیں اس لیے ان کی صحافتی تحریروں میں ایک مخصوص فضا کا احساس ہوتا ہے جس میں قاری کے
لیے مسرت اور بصیرت دونوں کا سامان ہے۔ اور یہی ادیب کی امتیازی خوبی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی زندگی کا ایک خاص نصب العین تھا۔ ان کے پیش نظر
ایک عظیم اصلاحی مقصد تھا۔ اسی لیے ان کی تخلیقات میں صالح تنقید کا شعور بیدار نظر آتا ہے۔
انہوں نے عام شاہرہ سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ بنائی تھی جس طرح سر سید احمد خاں کے
اسلوب میں اصلاح اور مقصدیت کا غلبہ ہے اسی طرح مولانا عبدالماجد کی تحریروں میں بھی
مقصدیت کا آہنگ واضح ہے۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں وہ البیال پن نہیں جس کی وجہ سے

[۱] محمد حسن رضا رانچی مشمولہ 'ادب کی تعمیری جہت، ص: ۹۷

نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر، محبوب و مشہور ہوئے۔ انہوں نے گرمی بازار کے لیے کبھی زور قلم صرف نہیں کیا ہے۔

اسلوب میں الفاظ کی ترتیب اور انتخاب کا سلیقہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اسی پر اسلوب کا دارومدار بھی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے تحریروں میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ زہر عشق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''لکھنو ہے واجد علی شاہ۔ جان عالم کا لکھنو۔ ہر لب پہ گل کا افسانہ ہر
> زبان پہ بلبل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوش تمنا۔ ہر
> شام میلے ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم۔'' [۱]

اس عبارت میں الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ دیکھیے۔ کہیں مقفیٰ بھی ہے لیکن کہیں بھی تصنع و بناوٹ نہیں ہے۔ مولانا کے چھوٹے چھوٹے، ہلکے پھلکے، سبک اور نازک جملے، نیز پیچیدہ ترکیبوں اور مشکل الفاظ سے احتراز ان کے انشائیوں کی شگفتگی میں اضافہ کرتے ہے۔

بعض مخصوص الفاظ کسی مصنف کے ذہن کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی دو طرح کے ہیں یا تو وہ عام استعمال کے الفاظ ہوں گے مگر ایک مصنف کی تحریر میں اتنی بار آئیں گے کہ اس کی مخصوص افتادِ ذہنی، رجحان طبعی اور زاویہ فکر کا نشان بن جائیں گے یا بعض مصنفوں کے فن پاروں میں نئے اور غیر مانوس الفاظ ایسی خوبی اور خوب صورتی سے استعمال ہوں گے کہ نہ صرف ان کے اسٹائل کو دل پسند اور دل نشین بنادیں گے بلکہ ان کی انفرادیت کو بہت نمایاں کردیں گے۔ مولانا عبدالماجد کی تحریروں میں دونوں کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اخبار ''صدق'' کے عنوانات دیکھئے۔

---

[۱] معین الدین حسن علوی مولانا عبدالماجد۔ بحیثیت ادیب و ناقد مشمولہ فروغ اردو لکھنو اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۱۸۶

''خوشامدیوں کے نرغے میں'' ''قانون کی دھجیاں،'' ''جدت کی قدامت'' ''بلندیوں کی پستیاں،' 'عزت مآب سے تمسخر،' 'بے غیرتی کی منطق'' ''بچکانہ منطق'' ''درمدح گودمی گوید،'' ''بزدل سورما،' 'تیز مرچ کی چائے'' ''ایسے ویسے کیسے ہوگئے'' ''ناگفتنی پر گفتگو'' جہاں بات بنائے نہ بنے،'' ''پہاڑ کھودنے کے بعد'' ''بڑوں کی ہاتھاپائی'' ''شکاری اپنے ہی جال میں،' 'بھیڑیے پاساں کے روپ میں''

اخبار ''سچ'' کی عنانِ ادارت سنبھالنے کے بعد سے تقریباً پچاس سالوں میں جو کچھ ان کے قلم سے لگا، وہ صحافت کی دنیا میں ایک حسین اضافہ ہے۔ اس عرصہ میں ان کے قلم کی کاٹ اور تحریر کی دھار میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ان کا لہجہ حیرت ناک طور پر اتنا یکساں اور ہموار ہے کہ کبھی بھی پستی اور بلندی کا فرق نہیں پیدا ہوتا۔

اردو کے بہت سے دانشوروں اور نقادوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے اس منفرد اسلوب کی داد دی ہے۔ جمیل مہدی لکھتے ہیں۔

> وہ اردو میں ایک طرز خاص کے موجد اور لہجہ کے ایک خاص اسلوب کے مخترع ہیں، ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے غضب کی بلاغت، مضمون آفرینی ضبط و توازن اور ایجاز و اعجاز سے بھرپور ساری کیفیتیں اور خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں جو کامیاب اشعار کے لیے لازمی قرار دے گئے ہیں لیکن ان تمام معنوی خصوصیات کے باوجود یہ فقرے اشعار نہیں بن پاتے، نثر کا ہی ایک اسلوب رہتے ہیں اور یہ مولانا عبدالماجد کی تحریر کا وہ کمال ہے جس میں اردو نثر کا کوئی بھی صاحب اسلوب انشاء پرداز ان کا شریک نہیں۔[۱]

[۱] جمیل مہدی 'مولانا عبدالماجد دریابادی، عالم، مصنف، صحافی اور دانشور، مشمولہ فروغ اردو لکھنو اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۶۵

مولانا طنزیات کے گویا بادشاہ تھے۔ ان کی تحریروں میں طنز کی ایک خاص چبھن محسوس کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ طنز کسی تحقیر کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ تعمیری جذبے کے ساتھ استعمال کیئے گئے ہیں۔ یہ طنز و مزاح ان کے خاص ہتھیار ہیں۔ جن سے وہ اپنی باتوں کو کامیابی کے ساتھ ذہن نشین کراتے ہیں۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے طنز کے لیے مختلف حربے استعمال کیے ہیں۔ کبھی معترضہ جملوں سے یہ کام لیا اور کبھی محاروں سے۔

اردو نثر میں قاضی عبدالغفار، مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کی طنز نگاری مشہور و مقبول ہے۔ مگر مولانا عبدالماجد دریابادی کی طنز کے مختلف روپ ہیں۔ وہ کہیں نشتر ہے اور کہیں چٹکی۔ کہیں طمانچہ ہے کہیں گدگدی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا موصوف کی طنز نگاری دین و اخلاق کی دعوت ہے۔ وہ صاحب پیغام اور صاحب دعوت ادب و طنز نگار ہیں۔

کسی نے سچ کہا کہ طنز ایک طرح کا عمل جراحی ہے، بشرطیکہ لطافت کے ساتھ ہو اس میں مواد کو اصل اہمیت ہے، خواہ اس کا روپ کیسے بھی ہو۔ مولانا عبدالماجد نے اس ہتھیار کے ساتھ اپنے انداز تحریر کو منفرد اور صحافت کو ایک مخصوص طرز کی صحافت بنانے میں کامیاب رہے۔ طنز کی ایک خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ بہت گہرا ہو۔ مولانا کی تحریر کا طنز بہت گہرا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا لب و لہجہ بعض اوقات غیر معمولی طور پر تیز، تند اور تلخ بلکہ کبھی کبھی درشت ہو جاتا تھا۔ ایک کے ایک قدر آور ناقد ڈاکٹر خورشید الاسلام نے تو ان کے انداز تحریر میں ''خشونت'' بھی پائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام، وطنیت، قوم، رواداری، تعصب تہذیب، کلچر اور مذہب اور بے دینی کے بارے میں مولانا کا جو نقطہ نظر تھا اس کے خلاف یا اس سے کچھ ہٹی ہوئی اگر کوئی تقریر یا تحریر پڑھتے یا کوئی واقعہ سنتے یا دیکھتے تو وہ اسے انگیز نہ کر پاتے اور اس پر انتہائی طنزیہ انداز میں تبصرہ ضرور کرتے۔ بدعنوانی اور ظلم و زیادتی کے

خلاف اپنے مخصوص انداز میں لکھنا ان کا شعار تھا۔ صدق جدید کے چند اقتباسات سے مولانا کی طنز نگاری کا کچھ انداز ہوسکتا ہے۔

> ''امریکہ آپ اپنی نظر میں''۔ ہر سال امریکہ میں ۵۰ ہزار خودکشی اور ۴ لاکھ اقدام خودکشی کے واقعات۔ اور یہی حاصل ہے جس تہذیب و تمندن کا، آپ اسی کو لینے کے لیے اپنے سر اور آنکھوں سے تیار رہتے ہیں''۔[۱]

خاندانی منصوبہ بند کے سلسلہ میں حکومت ہند کا جورو یہ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں صدر جمہوریہ مسٹر گری نے روس کا دورہ کیا وہاں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ مولانا عبدالماجد نے اس خبر پر جو سرخی دی وہ طنزیہ تحریر کی لاجواب مثال ہے۔

> ''فطرت کا گہرا طنز، صدر جمہوریہ ہند مسٹر گری کا خیر مقدم ازبکستان میں'' کثرت اولاد پر وزیر اعظم ازبکستان کی طرف سے دلی مبارکباد، مسٹر سرسوتی گری اگر ازبکستانی ہوتیں تو انہیں بہترین ماں کا اعزاز ملتا اور یہ سب کچھ عین اس وقت جب ہندوستان میں ہفتہ خاندانی منصوبہ بندی منایا جاچکا تھا اور جہاں اولاد کی بندش اور حد بندی پر چھپنے والے بے شمار سرکاری پوسٹروں، ہینڈ بلوں، کتابوں اور اعلانوں کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ ''[۲]

مولانا دریابادی نے طنز نگاری میں جس جرأت، ایمانداری اور حق گوئی کا ثبوت دیا وہ صرف انہی کا حق ہے۔ بلاشبہ وہ اس میدان میں نثر کے اکبر الہ آبادی مانے جاتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی۔ صحت زبان ان کی تحریر کی ممتاز

---

[۱] ہفتہ وار ''صدق جدید''

[۲] ہفتہ وار ''صدق جدید''

خصوصیت ہے۔ نثر میں شعروں کا برمحل استعمال ان کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے۔ ان کی تحریروں میں مصرعے اور اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے اسی موقع کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولانا دریابادی کی تحریروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے خامہ طراز ہیں۔

''یہ واقعہ ہے کہ مولانا نے جو علمی مقالات یا کتابیں لکھیں ہیں۔ ان میں ایسی چاشنی ہے کہ پڑھنے والا جب ان کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو پڑھتے پڑھتے اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ انداز بیان دلکش، جملوں میں روانی و سلاست حیرتناک اور دلچسپ جملے، مختصر مگر چست اور سادے، جو چیز بیان کرتے ہیں اس کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں، پھر کمال یہ کہ جملے ایسے رسیلے اور چبھتے ہوئے لاتے ہیں جو دلوں پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں۔''[۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوب میں ہم یہ بات خاص طور پر دیکھتے ہیں کہ جس طرح ایک شاعر نیچر کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے اشعار میں اسے سمو دیتا ہے بالکل اسی طرح ان کا قلم قدرتی مناظر، قلب انسانی کی مختلف کیفیات، علم و فلسفہ کے نکات اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری کے سامنے واقعات کی ساری کڑیاں آجاتی ہیں۔ ماہ صیام کی آمد کا حال لکھتے ہیں۔

''روحانی بارش کا موسم پھر آ گیا، دلوں کی کھیتی پھر ہری ہونے لگی۔ رحمتوں کی گھٹائیں پھر جھم جھم برسنے لگیں۔ برکتوں کے کنول پھر کھلنے لگے۔ عفو و مغفرت کے خزانے ایک بار پھر وقف عام ہو گئے۔ جنت کا

[۱] مولانا محمد طیب قاسمی، مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی خدمات مشمولہ نیا دور، اپریل، مئی ۱۹۷۸، ص:۶

ٹکٹ پھرارزاں ہوگیا۔[۱]

مولانا دریابادی کا نثری اسلوب خاص طور پر کالم ''سچی باتوں'' کا اسلوب ان کی طبعی لطافت اور وسعت مطالعہ کا رہین منت ہے۔ان کے سادہ اور سلیس الفاظ پرکاری کا باعث ہوجاتے ہیں۔موضوعات کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب اور حسن ترتیب، ان کے متوازن جملوں اور مترادف فقروں کو سحر و اعجاز کا مرتبہ دے دیتی ہے۔ان کے لہجہ کا زور اور معنویت کا اشاریت سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔ان کا طرز تخاطب اور جذبات کی لہریں نثر میں نظم کا کیف وسرور پیدا کردیتی ہے۔

مولانا دریابادی جس وقت جذبات کی ترجمانی اور نفسیات کی مصوری کرتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک صوتی حسن ہوتا ہے، مذہبی، سماجی، سیاسی، تاریخی مسائل کو بھی لکھتے ہیں تو حددرجہ نغمگی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ۔ملٹن نے کہا ہے ''سادگی، جوش اور اصلیت شاعری کی جان ہے''۔اس معیار پر مولانا دریابادی کی نثر کو پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں اجزاء اس میں پورے توازن کے ساتھ موجود ہے۔

مولانا دریابادی کی تحریر میں ایک طرف مولانا محمد علی جوہر کی صحافت وصداقت، خودداری ووطن پرستی، بے باکی وشیوا بیانی کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف اکبرالہ آبادی کی ظرافت وخوش طبعی، رنگینی وزندہ دلی، لذت ولطافت دیکھائی دیتی ہے۔مولانا کے احساسات کی شدت اور جذبات کی گہرائی، حزن ویاس کی مصوری اور شخصی رنج وغم کی ترجمانی کا نمونہ دیکھنا ہو تو اپنے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب کے سانحہ ارتحال کے بعد اپنی اہلیہ کے انتقال پر لکھی گئی تحریر ملاحظہ کیجیے۔

> ''بھائی صاحب نے دسمبر ۱۹۶۰ء میں دفعتاً انتقال کیا۔دل توڑنے کو یہی صدمہ کیا کم تھا کہ محبوب بیوی شروع جنوری ۱۹۶۹ء میں اپنے میکے

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی ''سچی باتیں'' مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ص: ۱۱۵

باندے میں بالکل دفعتاً سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ اس نے تو مجھ کو بالکل ہی بجھا دیا۔ چنانچہ آج تک ہنسی اس کے بعد سے ہونٹوں پر نہیں آئی ہے اور اب امید اور انتظار اس کا رہنے لگا ہے کہ دیکھیے کب اس مرحومہ کا دیدار نصیب ہوتا ہے''۔[1]

ذیل میں اسلوب کے حوالے سے مولانا کی صحافت کے بعض اور اوصاف پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

رعایت لفظی:

مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوب کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نثر میں رعایت لفظی اس کمال سے استعمال کرتے ہیں کہ بعض اوقات بڑے بڑے مضمونوں کا کام کر جاتا ہے۔ ایک مرتبہ علی گڑھ جاتے ہوئے ٹرین میں پروفیسر آل احمد سرور کا ساتھ ہوگیا۔ اس سفر اور قیام علی گڑھ کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''جب سرور رفیق سفر ہوتو اب غم کیا''۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں منعقد ہوا اپنی تقریر میں اردو کی کس مپرسی کا بھی ذکر کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد ''صدق جدید'' میں لکھتے ہیں۔ ''خوب ہوا جو 'رشید' کے یہ ارشادات 'مرشد' کے سمع ہمایوں تک براہ راست پہنچ گئے۔''

(یہ بات ذہن میں رہے کہ رشید احمد صدیقی ذاکر صاحب کو مرشد کہتے تھے۔)

---

[1] ہفتہ وار ''صدق'' ۶ رجون ۱۹۴۱ء

صنعت تضاد:

مولانا متضاد الفاظ کے استعمال سے بھی صدق کے اخبار کی سرخیوں کی چمکا دیتے تھے۔ مثلاً: گرانی کے ٹھاٹھ، دانا کی نادانی، مظلوم کا ظلم، بزدل سورما، بلندیوں کی پستیاں، جدت کی قدامت، وغیرہ

اشعار اور مصرعوں کا برمحل استعمال

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے اخبار کی سرخیوں کے لیے زبان زدِ مصرعوں کا استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے تحریروں کا لطف دوبلا ہوجاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی سرخیاں دیکھئے۔

''کٹے زباں تو خنجر کو مرحبا کہیے'' ''مصطفی نایاب وارزاں بولہب'' ''ایک کش مکش برق وشرر دونوں طرف ہے۔'' ''دل پھر طواف کوے ملامت کو جائے ہے'' ''دونوں کو اک ادامیں رضامند کرگئی''۔ وغیرہ

استفہام:

مولانا دریابادی اپنی تحریروں میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے استفہامیانہ انداز میں کثرت سے لکھتے ہیں۔ کبھی استفہام اقراری اور کبھی استفہام انکاری۔ مثلاً: سچی باتوں کے ایک کالم میں لکھتے ہیں۔

(۱) ''آپ کے نزدیک دنیا میں انسان کے لیے سب سے زیادہ قطعی اور یقینی شئے کیا ہے؟ کیا درازی عمر؟ کیا خوبی صحت؟ کیا مال ودولت؟ کیا عزت وجاہ؟ کیا کثرتِ اولاد واحباب؟ ان میں سے یا اس قسم کی، کسی شئے کا حاصل ہونا کسی انسان کے لیے بھی قطعی

اور یقینی کہا جاسکتا ہے؟

(۲) ''آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مشغلہ کیا تھا؟ کس شغل میں آپ زیادہ لگے رہتے تھے؟ کون سا کام آپ کو دل سے پیارا تھا؟ کیا تصنیف و تالیف؟ کیا لکھنا پڑھنا؟ کیا بحث ومناظر؟ کیا منطق وفلسفہ؟ کیا تاریخ وجغرافیہ؟ کیا ملازمت ووکالت؟ کیا نذر ونیاز لینا؟ کیا قبروں کی مجاوری؟ کیا مکان وجائداد کی فکر، کیا روپیہ جمع کرنا، کیا بیمہ اور بینک کا حساب کتاب، کیا صنعت ورحرفت؟ کیا شعر وافسانہ؟''[۱]

مختصر یہ کہ عبدالماجد کے اسلوب کی انفرادیت کا راز ان کی شخصیت، علم اور احساس کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ انہوں نے اکیلے اردو نثر کو کتنے ہی اسالیب دیئے ہیں۔ مولانا کے فقروں کے ٹھاٹھ کسی بربت نواز کے تال سُر سے کم نہیں ہوتے اور ان کے لہجے کا زور اور معنویت کی اشاریت سونے پر سہاگہ کام کرتی ہے۔ ان کا طرزِ تخاطب اور جذبات کی لہریں نثر میں نظم کا کیف وسرور پیدا کر دیتی ہیں۔ اور ان کی رمزی وایمائی نگارشیں ادب لطیف کی خصوصیات کی حامل ہوجاتی ہیں۔ روبانیت اور رعنائیت، رنگینی اور معنی آفرینی، ان کے ہر جملہ میں اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی عبادت کو تاثیر وطلسم کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ ڈاکٹر سید احتشام حسین نے درست کہا ہے کہ ان کا اسلوبِ تنقید تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک استدلالی رنگ رکھتا ہے۔ بہت سے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔

[۱] مولانا عبدالماجد دریابادی ''سچی باتیں'، مرتب: نعیم الرحمن صدیقی ص: ۸۴

مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ذات گونا گوں اوصاف کی حامل تھی۔ ان کی کتابِ زندگی علم وحکمت کا ایک شاندار مجموعہ تھی۔ جس کا ہر ورق اپنی گونا گوں خوبیوں سے مزین اور تابندہ ہے۔ مولانا گلشن حق کے اُن لالہ وسنبل میں سے ہیں جن کی خوشبو ہمیشہ دل ودماغ کو معطر کرتی رہتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بارہ بنکی کے معروف قصبہ دریاباد کے ایک علمی گھرانے میں ۱۶/ مارچ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد سیتاپور ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور وہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ان کی دلچسپی کے مضامین انگریزی اور منطق تھے، اسی زمانے میں ان کو فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ فلسفہ سے ایم۔ اے کرنے کے لیے علی گڑھ گئے مگر والد کے انتقال کے بعد جی نہ لگنے کے سبب واپس چلے آئے۔ مطالعہ اور مضمون نگاری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ ابتداء میں انہوں نے جو مضامین لکھے وہ فرضی ناموں سے شائع کرتے رہے البتہ جب مزاج وعلم دونوں میں پختگی آنے لگی تو اپنے مضامین اصلی نام سے شائع کرنے لگے، اور بہت جلد علمی وادبی حلقوں میں ان کی حیثیت مسلم ہوگئی۔

بی۔ اے کرنے کے بعد ان کی زندگی کا آغاز الحاد اور بے دینی کی وادی کی سیر سے

ہوا۔ تلاشِ روزگار کے لیے جب ادھر اُدھر ہاتھ پھیلانے لگے تو مولوی عبدالحق کے توسط سے دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں تقریباً گیارہ مہینے ترجمہ کے کام پر مامور رہے۔ ''فلسفہ جذبات'' اور ''فلسفہ اجتماع'' جیسی الحادو تشکیک سے پُر کتابیں، اسی دور کی تخلیقات ہیں۔ لیکن بزرگوں کی صحبت خصوصاً مولانا شبلی، اکبرالہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کی رفاقت نے ان کی فکر کو بدل ڈالا۔ جس کے بعد وہ توحید و رسالت کے ایسے داعی و مبلغ بنے کہ سند یافتہ عالم نہ ہونے کے باوجود بھی یا باوقار عالم تسلیم کئے گئے۔

مولانا اردو تنقید نگاری میں ایک خاص رنگ کے امام تھا۔ اردو شعر و ادب کی رمز شناسی میں شاید ہی کوئی ان پر سبقت لے گیا ہے۔ لکھنؤ تہذیب کے ساتھ ساتھ لکھنوی شاعری اور اس کے نثری اسلوب کے بڑے دلداہ تھے۔ زہر عشق، مرزا رسوا اور گل بکاؤلی پر ان کے تبصرے ان کی نقادانہ دقتِ نظر کے شاہکار ہیں۔ غالب کو فلسفی کے بجائے ہر بات کو حکیمانہ انداز میں کہنے والا شاعر، مرزا شوق کو ایک بدنام شاعر، حالی کو ایک واعظ شاعر، اکبرالہ آبادی کی شوخ تعمیری ظرافت کو ایک نیا آئین اکبری، شکوہ میں اقبال کو صاحب حال و سالک اور جوابِ شکوہ میں صاحبِ مقام و عارف کہہ کر نقادوں کے ذہنوں کے نئے دریچے وا کر دیئے۔

مولانا اپنے زمانے میں اردو انشاء پردازی کے بھی امام رہے ہیں۔ وہ اپنے طرز کے موجد و خاتم تھے۔ وہ شبلی، مہدی افادی اور سید سلیمان کے انداز بیان کے بڑے دلدادہ اور قدرداں تھے۔ مگر اپنے طرز نگارش میں کسی کی تقلید پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنی انفرادیت کو کہیں سے داغدار نہ ہونے دیا۔ ان کی طنزیہ تحریروں میں جہاں تندی بادِ صبا، موج خرام یار، سرمستی نکہت باد بہار کا جاں نواز کیف و نشاط ہے وہیں حریفان کجرو کے لیے نشتر کی کھٹک، تیرِ نیم کش کی خلش اور تیغ آبدار کی کاٹ بھی ہے۔ ان کے قلم کی صف شکن یلغار نے ان کی انشاء پردازی کے جوہر کو چمکا کر چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اپنے عزیزوں، دوستوں اور محبوب معاصرین کے سانحۂ ارتحال پر ماتم کرتے تو اس میں دل سوزی، حسن عقیدت اور وفا کیشی

کے ساتھ ان کے قلم کی رعنائی، شگفتگی اور رنگینی کی پوری بہار آفریں قوسِ قزح نظر آتی ہے۔

مولانا عبدالماجد نے تذکرہ وسوانح، شعروادب، تاریخ وفلسفہ، تفسیر واسلامیات اور اجتماعی وملی مسائل پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی۔ لیکن آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جو بقائے دوام کا ضامن ہے وہ صحافت کی خدمت ہے۔ انہوں نے متعدد اردو انگریزی اخبارات میں مضامین لکھے اور بعض کی ادارت کے فرائض بھی انجام دئے۔ ان میں ہمدم، ہمدرد، حقیقت، اور معارف قابل ذکر ہیں۔

۱۹۲۵ء مولانا عبدالماجد نے ایک ہفتہ وار دینی واصلاحی پرچہ ''سچ'' کے نام سے نکالا۔ اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور خصوصیت کے ساتھ مغربی تہذیب کے سیلاب سے ان کو بچانا تھا۔ اس اخبار کی زبان بہت ہی سہل اور دل نشین ہوتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں سفرِ حج وزیارت مدینہ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ اور پورا سفرنامہ اولاً اخبار ''سچ'' میں قسط وار بعد ازاں کتابی شکل میں ''سفرحجاز'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے مطالعہ سے ان کی انشاء پردازی کا اصل رنگ ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۹۳۲ء میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ وتفسیر کے کام کا آغاز کیا۔ اسی لیے اخبار ''سچ'' کو وقتی طور پر بند کردیا۔ ۱۹۳۴ء سے یہی اخبار صدق کے نام سے لکھنو سے نکلنا شروع ہوا۔ شروع شروع میں دہ روزہ تھا۔ بعد ازاں ہفتہ وار ہوگیا۔ اس کی سچی باتوں اور اشارات اور مقالات نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کرلی۔ صدق نے نہ صرف اخبار 'سچ' کی سابقہ خصوصیت کو برقرار رکھا بلکہ عہد حاضر کے جدید ترین فتنوں کے مقابلہ میں بھی اس اخبار نے نمایاں شہرت حاصل کرلی۔ اس کے علاوہ اُردو کتب اور رسائل پر اس کی بلند پایہ تنقیدات کی بھی ملک میں دھوم مچ گئی۔ ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کے باعث اخبار صدق بند کرنا پڑا اور چند ماہ کے تعطل کے بعد یکم دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار،

''صدق جدید'' کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ ہر ہفتہ اس کے اقتباسات ہند اور پاکستان کے بیشتر اخبارات میں کثرت سے نقل ہوا کرتے تھے۔ اُردو کے بہت کم پرچے ایسے ہوں گے جن کے مضامین اس کثرت سے دوسرے پرچے اپنے یہاں نقل کرتے ہوں۔

ہفتہ وار اخبار ''سچ'' یا ''صدق جدید'' چھوٹے سائز پر طبع ہوتا تھا۔ کل آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کو شروع سے آخر تک مولانا ہی لکھتے۔ جو ان کے قلم کی صاعقہ پاشی کی دلیل ہوتی۔ ''سچ'' کے دوسرے ہی شمارہ سے ''سچی باتیں'' کے نام سے ایک فقید المثال کالم شروع کیا تھا۔ اس کی نظیر دوسروں اخبارات میں کم ہی ملتی ہے۔ اس میں کبھی تو واعظ کبھی فقیہ کبھی مجتہد کبھی مردمومن، کبھی مفسر قرآن، کبھی متکلم اسلام، کبھی نقاد، کبھی سیاسی مبصر، اور کبھی اسلوب کے جمشید اور کبھی زور بیان کے رستم بن جاتے۔ وہ اپنی آخری عمر میں مطمئین رہے ہوں گے کہ علم وادب اور فن کا ایک انبار نہیں بلکہ گل وگلزار لگا کر زندگی ختم کررہے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا کالم ''سچی باتیں'' لوگوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ لوگوں نے ان کالموں کا انتخاب کتابی شکل میں شائع کیے۔ چنانچہ دکن کے حکیم ہلال اکبری نے ۱۳۱۳ صفحات پر مشتمل کتاب مرتب کر کے شائع کیا۔ حکیم ہلال اکبری نے ان کالموں پر موزوں سرخیاں بھی لگائی ہے۔ اس کے علاوہ ''سچی باتوں'' کا ایک اور انتخاب ''مولانا کے نواسے ''نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی نے بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے کالموں میں جہاں مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کے نصیحتیں ہیں وہیں پر تمام سماج کے افراد واقوام کے لیے بھی ہدایت کی باتیں ہیں۔ جس کی بناء پر ان کے کالموں میں ادب برائے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایڈیٹر معارف مولانا عبدالماجد کی صحافتی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

انہوں نے سچ اور صدق نکال کر اپنے آپ کو شیر دل بلکہ کفن بردوش صحافی بھی ثابت کیا۔ حکومت کا دبدبہ، قانون کا شکنجہ اور مخالفت ومعاندت کا کوئی ہچکولہ ان کے قلم کی آزادی کو روک نہ سکا۔ مسلمانوں کے غمخوار، غمگساز کے روپ میں ان کے سیاسی مضامین المناک حوادث پر خون کے آنسو روئے۔ ان کی سیاسی کامیابی وکامرانی پر مسرت وشادمانی کا دل کھول کر اظہار کیا۔ صدق جدید، میں ایمان وایقان اور عرفان کے موتی بکھیرتے رہے۔ ان کے ساتھ اسلامی طرز فکر چھوڑنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترتے، کردار کو نیلام کی بولی پر بھینٹ چڑھانے والوں کے نہاںخانوں پر شب خون مارتے اور اپنی تحریر کی ناوک فگنی سے جدد پسندوں کے کلیجوں کو چھلنی کرتے رہے۔ ان کے اخبار کے ایک شعر ایک جلی سرخی، ایک تیکھا فقرہ ان کے حریفوں کے پورے مضمون پر بھاری ہوتا۔ ع

عصر نو میں اے دیارِ فقر و دیں کے تاجدار
تیرے دل کا صدق تھا تیری نظر سے آشکار [1]

مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے صدائے حق بلند کرینوالے اور دلیر صحافیوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن مولانا اپنا مخصوص اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ حق بات قارئین کی خدمت میں پیش کرنا، کلمہ صداقت کو طشت از بام کرنا، اور مخالفت کو کھری سنانا۔ مدیر صدق کا مسلک رہا ہے۔ اس کفر والحاد کے دور میں سچ اور صدق کا مقصد وجود ہی خود مولانا کے الفاظ میں ''شیطانی قوتوں کی بیخ کنی اور دجالی مرعوبیت کو دلوں سے دور کرنا ہے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی نے کئی مضامین لکھے اور کئی مضامین وکتابوں کے تراجم کئے۔ ان کی کتابوں میں تصوفِ اسلام، خطوط مشاہیر، خطباتِ ماجدی، مکتوبات سلیمانی، سفرِ

[1] سید صباح الدین عبدالرحمن، ماہنامہ ''معارف'' فروری ۱۹۷۷ء

حجاز، محمد علی کی ذاتی ڈائری، بشریتِ انبیاء، قصص ومسائل، اعلام القرآن، ارض القرآن، الحیوانات فی القرآن، اکبر نامہ، حکیم الامت، آپ بیتی، نشریات ماجد، وفیات، انشائے ماجد، ترجمہ شرح مناجاتِ مقبول وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن اگر کوئی زندہ جاوید تصنیف ہوسکتی ہے تو وہ ''تفسیر ماجدی'' ہے جو طرز واسلوب میں یگانہ روزگار ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ممبر ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ بریٹن (لندن) وایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) بھی تھے۔ آپ ایک صاحب اسلوب صاحب طرز ادیب کے ساتھ ساتھ ایک کہنہ مشق صحافی بھی تھے۔ صدق اور صدقِ جدید کے تبصرے، رائیں اور مشورے سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے صحافت کے ذریعہ جو خدمت انجام دی ہے وہ خود ایک عظیم خدمت ہے اور بہت سارے لوگوں نے اس مختصر سے اخبار سے بہت کچھ حاصل کیا ہے مولانا مرحوم کی تمام تحریریں جمع کی جائیں تو وہ ایک اکیڈمی کی خدمات سے بڑھ جائیں گی اور نوجوانوں کو حیرت ہوگی کہ کس طرح اتنا بڑا علمی ذخیرہ مولانا اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنواور دارالمصنفین اعظم گڈھ سے آپ کے خصوصی روابط تھے۔ علّامہ سید سلیمان ندویؒ کو اپنا بزرگ اور شفیق استاد تسلیم کرتے تھے۔ مکتوبات سلیمانی کی پہلی جلد کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ سید صاحب سن میں مجھ سے ۷ یا ۸ سال بڑے تھے لیکن اپنے کمال شفقت سے برتاؤ میرے ساتھ اس قسم کا رکھے ہوئے تھے جیسے ایک بے تکلف دوست دوسرے دوست سے رکھتا ہے۔ سید صاحب سے اپنے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان سے میرے تعلقات سنہ 9ء اور 10ء سے ہی قائم ہوچکے تھے جبکہ وہ نئے نئے ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے تھے اور میں کیننگ کالج لکھنؤ کا طالب علم تھا۔ مولوی عبدالماجد کو علّامہ سید سلیمان ندوی سے حد درجہ محبت تھی۔ انہوں نے علّامہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ انہوں نے سید صاحب کے اپنے نام لکھے گئے (372) خطوط کا مجموعہ ''خطوط سلیمانی'' کے نام سے محفوظ کیا ہے جو 40 سال کے عرصہ کی مدت میں جمع کئے گئے تھے۔ ان

خطوط میں ادبی، دینی بحثیں، سیاسی، علمی اور گھریلو واقعے سب شامل ہیں۔ غرض مولانا ماجد سب سے زیادہ اگر کسی شخصیت سے متاثر تھے تو وہ شخصیت علاّمہ سید سلیمان ندویؒ کی تھی۔

جہاں مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا سید سلیمان ندوی سے حد درجہ متاثر تھے وہیں مولانا سلیمان ندوی بھی مولانا ماجد سے ویسے ہی متاثر تھے۔ اپنے کئی خطوط میں انہوں نے مولانا ماجد کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے اور اپنی اور دوسروں کی تصانیف کے سلسلے میں انگریزی مضامین سے تراجم کی درخواست کی ہے۔ مولانا آزاد کے الہلال کے لیے، خود اپنی سیرت النبیؐ کے مضامین کی تیاری میں کئی انگریزی مضامین کے تراجم مولوی عبد الماجد سے کروائے۔ سیرۃ النبی کے لیے ایک اہم مضمون 'فلسفۂ تشکیک مذہب کے موافق ہے یا مخالف'' انگریزی سے اخذ و ترجمہ کروا کے شائع کیا۔ سید سلیمان ندوی عبدالماجد کے مضامین اور دیگر تصنیفات پر ان کی دلجوئی، ہمت افزائی اور مفید مشورے بھی دیتے۔ عبد الماجد نے 1915ء میں 23 سال کی عمر میں ایک ڈرامہ ''زود پشیماں'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ مجھے اس ڈرامے کو اپنے نام سے منسوب کرتے ہوئے شرم آتی تھی اس لیے محض 'ناظر' کے تخلص سے اُسے شائع کیا تھا۔ فرنگیت اور آزاد خیالی کے باوجود اتنی مشرقیت اُس وقت بھی مزاج میں تھی کہ کوئی ناول یا ڈرامے کو اپنے سے منسوب کرنے میں فخر نہیں شرم محسوس ہوتی تھی۔ نام کو مخفی رکھنے کے باوجود علاّمہ نے پہچان لیا اور ستمبر 1916ء کے ایک خط میں رقمطراز ہیں۔ ''زود پشیماں کے مصنف کو میں نے بہت جلد پہچان لیا۔ اتنے ایسے اشخاص ہیں جن کی تحریر کی ایک ایک سطر میں پہچانتا ہوں۔ شبلی، نذیر احمد، ابوالکلام، عمادی، ماجد۔ شائد آپ بھی یہی الزام مجھ پر قائم کریں۔ میں آپ کو اس ادبی کامیابی پر صمیم قلب سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اگر قلّت ضخامت وصفحات کوئی عیب نہ ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی ڈراما علم و فن کی حیثیت سے ہماری زبان میں نہیں لکھا گیا۔ غزلیں بھی نہایت سنجیدہ اور رواں ہیں۔ خیالات غالبؔ وعُرفیؔ سے ٹکراتے ہیں۔ کہیں کہیں

نظر ثانی وحلِ تعقید کی ضرورت ہے''۔اس خط میں علامہ نے ڈرامہ کی تعریف وتوصیف کے ساتھ اس کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دلادی۔

مولوی عبدالماجد کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی بہت عقیدت ومحبت تھی۔اُن کے علاوہ جن اصحاب سے وہ متاثر تھے ان میں مولانا شبلی نعمانی،مولانا اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر بھی تھے۔انہوں نے ان تین اصحاب فکر ودانش کے بھی خطوط کا مجموعہ ''خطوطِ مشاہیر'' کے نام سے 1944ء میں طبع کروایا۔ان تینوں حضرات سے اپنے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے تعلقات ان تین حضرات سے مخلصانہ ہونے کے ساتھ ہی محض خسروانہ اور نیازمندانہ تھے،معاصرانہ اور مساویانہ نہیں۔اور نہ ہوسکتے تھے۔اس لیے کہ مولانا شبلی کے زمانے میں میری کالج کی طالب علمی بس ختم ہی ہوئی تھی۔ حضرت اکبرالہ آبادی میرے والد کے ملنے والے اور سن میں اُن سے کچھ بڑے ہی تھے۔اکبرالہ آبادی سے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اُن سے مجھے شرفِ نیاز 1912ء میں حاصل ہوا۔غالباً مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا میں بی اے کا امتحان دینے الہ آباد گیا ہوا تھا (لکھنواُن دنوں یونیورسٹی سے محروم تھا اور ڈگری کے امتحانوں کے لیے الہ آباد جانا پڑتا تھا) وہیں حضرت اکبر کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی۔اس وقت مرحوم کا سن 66 برس کا تھا اور آفتاب عروج کو پہونچا ہوا تھا اور میں اپنی عمر کے 20 ویں سال میں۔مراسلت ایک سال بعد شروع ہوئی۔ابتدائی مکاتبت کے وقت میں فلسفی قسم کا دہری تھا۔ 19ء سے خطوط کا رنگ بدلا اور 1921ء میں حضرت کی وفات کے وقت میں نے بحمدللہ دہریت سے توبہ کرلی۔ اس اصلاح حال میں ایک خاصی حد تک حضرت اکبر کی شخصیت وتعلیمات کو بھی دخل ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شناسائی اور خط وکتابت دوسرے مشاہیر جیسے علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ سے بھی تھی۔ان کے علاوہ کالج کے زمانے کے دوستوں میں جن سے خصوصی تعلقات رہے ان میں محمد حفیظ سید عبدالباری ندوی اور خان بہادر ظفر حسین

خان قابل ذکر ہیں۔ کالج کے بعد جن دیگر علمی وادبی شخصیتوں اور بزرگوں سے انکی شناسائی اور تعلقات رہے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار، پنڈت بشن نارائن، پنڈت برج نارائن چکبست، بابوگنگاپرشاد، مرزا محمد ہادی، مہدی افادی، مولوی مسعود علی ندوی، ظفر الملک، چودہدری محمد علی رودلوی، راجہ محمود آباد، مولانا ابوالحسن علی ندوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

1918ء میں حیدرآباد کے قیام کے دوران مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا ظفر علی خان، مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی صدر الصدور اُمور دین حیدرآباد (نواب حیدر یار جنگ بہادر) ان سب حضرات سے کافی اچھے مراسم رہے۔ ان کے علاوہ یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد سابق وزیر اعظم دکن بھی مولانا عبدالماجد کی بہت قدر کرتے تھے۔

مولانا دریابادی نے اپنی زندگی میں جن اصحاب فکر ودانش سے اثر قبول کیا اور جن اصحاب کی صحبت نے ان کے کردار اور سیرت کو نکھارا ان کا دائرہ شبلی اور اکبر الہ آبادی سے لے کر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمد علی جوہر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تعلق سے آپ بیتی میں خود رقم طراز ہیں:

> ''میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین اور موثر دو شخصیتیں ہیں۔ ان دونوں نے کہنا چاہیے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ ان دونوں کا فیض محبت نہ نصیب ہوجاتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔ پہلا نام تو ہندوستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی کا ہے۔ یہ گویا میرے محبوب تھے۔ دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تھی۔ بزرگ اور عابد وزاہد بزرگ متعدد دیکھنے میں آئے لیکن مصلح، مزکی، مربی تو ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو

اشرف علی میرے مقتدا و مطاع۔ محبت کے مرکز اگر وہ تھے تو عقیدت کے مرجع یہ"۔[1]

مولوی عبدالماجد دریابادی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ وقت اور اصول کے بہت پابند تھے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف نماز، عبادات، علمی و ادبی کاموں کے لیے وقت کی پابندی تھی بلکہ گھر میں اندر آنے، لوگوں سے ملاقات کرنے، کھانے پینے اور دیگر مصروفیات کے لیے باضابطہ ایک نظام الاوقات تھا جس کے وہ ہمیشہ پابند رہے۔ اس قدر اصول اور ضابطہ کی پابندی بہت کم لوگوں کی زندگی میں دیکھنے میں آتی ہے۔ حتیٰ کہ سفر و حضر میں بھی ان اوقات و اصولوں کا خیال رکھتے تھے۔ پہلے سے طئے کئے بغیر وہ کسی بڑی سے بڑی علمی، ادبی و سیاسی شخصیت سے بھی ملنے کے روادار نہیں تھے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کی کامیابی کا راز یہی تھا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے اور مخالفین کے جواب میں ان کی تحریریں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ عدم تشدد کی افادیت کے لیے انہوں نے قرآن کریم کو رہنما اور سند بنا کر "ماڈرن ریویو" میں "اسلام اور ستیہ گرہ" کے عنوان سے مضمون لکھ کر ثابت کیا کہ ستیہ گرہ کی تعلیم اسلام کی امن پسندی سے کوئی الگ چیز نہیں۔ انہوں نے چرخہ کی حمایت میں حدیث کے حوالے سے اپنے مضمون میں لکھا کہ چرخہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت پسند تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت ام سلمہ کا قول نقل کیا کہ چرخہ شیطان کو بھگاتا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس عورت کے سوت کی بیڑی زیادہ لمبی ہوگی وہ زیادہ ثواب والی ہوگی۔

عبدالماجد تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے عملی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بھی بنائے گئے تھے۔ خلافت کمیٹی کانفرنس کے موقع پر صدر

[1] عبدالماجد دریابادی آپ بیتی ص:۳۵۲

استقبالیہ بھی عبدالماجد کو ہی بنایا گیا اس وقت انہوں نے جو صدارتی استقبالی خطبہ پڑھا اس سے اس وقت کی سیاست اور مسائل پر ان کی گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔

مولانا دریابادی ایک صاحب طرز صحافی تھے۔ ان کی طرز تحریر ایک منفرد شان رکھتی ہے۔ اگر کوئی آدمی مطالعہ کے شوقین ہوں اور عبدالماجد دریابادی کے دو ایک مضامین بھی پڑھ چکے ہوں تب اُس کے سامنے عبدالماجد کے ساتھ چند مشاہیر کی تحریریں نام چھپا کر رکھ دی جائیں تو بلا مبالغہ وہ مولانا دریابادی کی تحریریں الگ پہچان لیں گا۔ عبدالماجد کا لکھا ہوا ایک ایک فقرہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں عبدالماجد کے قلم سے نکلا ہوں۔ اسی لیے وہ اپنے طرز کے خود ہی موجد ہیں اور خود ہی خاتم بھی۔ مختصر سادہ اور بلیغ الفاظ میں ایک جملہ کے اندر معنی کا سمندر اگر دیکھنا ہو تو عبدالماجد آیابادی کو پڑھ لیں مثلاً امجدؔ حیدر آبادی کی سلور جوبلی کے موقع پر صرف ایک جملہ کا پیام روانہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ''شکر میں اور کیا چیز ڈالی جائے کہ اس کی شیرنی بڑھ جائے۔ نمک میں اور کیا چیز ملائی جائے کہ اس کی نمکینی میں اضافہ ہو جائے۔'' دیکھئے اس ایک جملے نے حضرت امجدؔ کی کیسی بلیغ تعریف کر ڈالی۔

مولانا مرحوم نے اپنے قلم سے ایک طرف تو اردو صحافت اور انشا پردازی کا معیار بلند کیا اور دوسری طرف اسلامیات و اخلاقیات کی تعلیم کو انوکھے اور دل نشین پیرایۂ بیان میں پیش کر کے افہام و تفہیم کی نئی راہیں کھول دی۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> ''دنیا میں اچھائی اور برائی کا ہونا سب مانتے ہیں، پر جھگڑا اس میں آکر پڑتا ہے کہ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ اچھی وہ چیز ہے جسے باپ دادا اچھا کہتے آئے ہیں۔ کسی نے اچھائی اور برائی کی پہچان کے لیے عقل کو سہارا بنایا ہے، اور کسی کا کہنا یہ ہے کہ سرکاری قانون کو مانے چلے جانا ہی اچھائی ہے''۔

اس کے بعد مولانا مرحوم نے اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی اس دل پذیر انداز میں کی ہے۔

> ''مسلمانوں کو جس راستہ پر چلنا ہے وہ ان سب سے الگ ہے۔اس نے جب دل کی سچائی کے ساتھ ایک بار کلمہ پڑھ لیا تو خدا کے سوا سب کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔اب نہ اسے پرواہ نی چاہیے کہ اس کے باپ دادا کیا کرتے چلے آئے ہیں، نہ اس کی فکر ہونی چاہیے کہ گردو پیش کے رسم ورواج کیا ہیں اور نہ یہ دردسر خریدنا چاہیے کہ حکمت وفلسفہ والے کیا کہتے ہیں، نہ اس جھگڑے میں پڑنا چاہیے کہ سرکاری قانون کا ضابطہ کیا ہے۔وہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ گیا،آفتاب روشن اس کی رہنمائی کے لیے موجود ہے،اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے کی اسے کیا ضرورت ہے۔اس کے چلنے کے لیے صاف وہموار وسیع و بے خطر سڑک موجود ہے۔اب وہ کیوں خواہ مخواہ ناہموار پگڈنڈیوں پر ٹھوکریں کھائے اور خاردار جھاڑیوں سے الجھتا پھرے۔مسلمان صرف خدا کا غلام ہے،اور سب کی غلامی سے آزاد اور اس کا کام صرف خدا کے بنائے ہوئے احکام کی پابندی ہے اور بس۔'' [۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی کے صحافتی تحریریں خصوصاً ''سچی باتیں'' کا کالمس بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ایک روشن باب تصور کئے جاسکتے ہیں طرز تحریر اور انداز بیان عالمانہ ہے اور ہر مضمون اپنی جگہ ایک شاہکار ہے گو کہ مختصر ہے لیکن بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر مضمون اپنے اندر زندگی کے کئی حقائق کو سمائے ہوئے ہے جیسا کہ ''کوزہ میں سمندر'' سمویا گیا ہے۔ہر مضمون فائدہ بخش ہے جس کو قاری پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کی زباں دانی اور شیوا بیانی ان کے تحریروں کو دلکش اور دل نشیں بنادیتی ہے اور ان کے سادہ و سلیس الفاظ پرکاری کا باعث ہو جاتے ہیں۔موضوعات کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب اور حسن ترتیب،ان کے متوازن جملوں اور مترادف فقروں کو سحر واعجاز کا مرتبہ دے دیتی ہے

[۱] ہفتہ وار سچ ۱۳؍فروری ۱۹۲۵ء مضمون بعنوان شاہراہ

اور تخیل کی پروازی نیز ندرتِ فکراُن کی مرصع و مقفیٰ عبارت کو موثر و منفرد بنادیتی ہے۔ اسے آپ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساز سے نکلے ہوئے نغموں کا جادو کہیے یا پھران کے قلب کے سوز کی تپش۔

مختصر یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی بامقصد صحافت کے سب سے بڑے علمبردار صحافی تھے۔ عام واقعات ومشاہدات سے حکمت ودانائی کشید کرنا، قوم وملت کی اصلاح وترقی کے لیے کوشاں بلاخوف وتردید صدائے حق کی تبلیغ کرنا، بلیغ اور معنی خیز اشاروں میں گفتگو، اطناب وتفصیل کے بجائے ایجاز واختصار کا التزام اور الطافت ونفاست کے پانی میں بجھے ہوئے طنز کے تیران کے اسلوب کی وہ خصوصیات ہیں جو انہیں دوسرے تمام صحافیوں سے ممتاز ومميز کرتی ہیں۔

کتابیات

نشان سلسلہ	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	ناشر	سن اشاعت
۱	ابوالفہیم وحید علی خاں	خوش بو (ادبی مضامین کا مجموعہ)	حیدرآباد	نونہال بک سنٹر	۱۹۹۳ء
۲	اطہر پرویز	ادب کا مطالعہ	علی گڑھ	اردو گھر	۱۹۸۶ء
۳	اقبال قادری سید	رہبر اخبار نویسی	دہلی		۱۹۸۹ء
۴	آل احمد سرور	تنقید کیا ہے؟	دہلی	مکتبہ جامعہ لیٹیڈ	۱۹۶۴ء
۵	آل احمد سرور	ادب اور نظریہ	لکھنؤ		۱۹۵۴ء
۶	امداد صابری	تاریخ صحافت ارو جلد اول	دہلی		۱۹۵۳ء
۷	امداد صابری	تاریخ صحافت ارو جلد دوم	دہلی		۱۹۵۳ء
۸	امداد صابری	روح صحافت	لکھنؤ	مکتبہ فردوس، مکارم نگر	۱۹۷۸ء
۹	انجم نعیم	ادب کی تعمیری جہت	علی گڑھ	کریسنٹ پبلشنگ کمپنی	1981ء
۱۰	انور علی دہلوی	اردو صحافت	دہلی	اردو اکادمی دہلی	۱۹۸۷ء
11	انیسہ سلطانہ	حیدرآباد میں طنز و مزاح	حیدرآباد	شگوفہ پبلی کیشنز	۱۹۸۶ء
۱۲	خواجہ عبدالغفور	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	دہلی	موڈرن پبلی کیشن ہاؤس	۱۹۸۳ء
۱۳	سیدہ جعفر (ڈاکٹر)	محک اور لہک	حیدرآباد	ادارہ پیکر	۱۹۹۵ء
۱۴	سید داؤد اشرف	بیرون مشاہیرِ ادب اور حیدرآباد	حیدرآباد		۲۰۰۳ء
15	سید داؤد اشرف	گذشتہ حیدرآباد	حیدرآباد		۲۰۰۲ء
۱۶	شارب ردولوی (ڈاکٹر)	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید		اردو اکامی دہلی	1991ء
۱۷	شہناز انجم (ڈاکٹر)	ادبی نثر کا ارتقاء	دہلی		۱۹۸۵ء
۱۸	طاہر تونسوی	طنز و مزاح، تاریخ و تنقید	دہلی	ماہنامہ شاہ ہند	۱۹۸۲ء
19	طارق سعید	اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب		ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	۱۹۹۶ء
۲۰	عابد صدیقی	ادب اور صحافت	حیدرآباد		۱۹۷۵ء

۲۱ عبدالسلام خورشید (ڈاکٹر) فن صحافت لاہور ۱۹۸۱ء
۲۲ عبدالسلام خورشید داستان صحافت لاہور ۱۹۸۰ء
۲۳ عبدالسلام خورشید کاروان صحافت لاہور ۱۹۶۴ء
۲۴ عبدالماجد دریابادی آپ بیتی لکھنؤ مکتبہ فردوس، لکھنؤ ۱۹۷۸ء
۲۵ عبدالماجد دریابادی وفیات ماجدی کلکتہ ادارہ انشائے ماجدی ۱۹۷۱ء
۲۶ عبدالماجد دریابادی سفر حجاز کلکتہ ادارہ انشائے ماجدی ۱۹۷۱ء
۲۷ عبدالماجد دریابادی ذکر و فکر اکبر الہ آبادی لکھنؤ خاتون منزل، لکھنؤ
۲۸ عبدالماجد دریابادی مقالات ماجد لاہور عشرت پبلشنگ ہاؤس
۲۹ عبدالماجد دریابادی انشائے ماجد کلکتہ ادارہ انشائے ماجدی
۳۰ عبدالماجد دریابادی سچی باتیں (مرتب: نعیم الرحمن صدیقی) لکھنؤ خاتون منزل لکھنؤ ۲۰۰۱ء
۳۱ عبدالماجد دریابادی سچی باتیں (مرتب: ہلال اکبری) حیدرآباد دکن پبلیشرز ۱۹۴۷ء
۳۲ عتیق الرحمن (ڈاکٹر) عبدالماجد دریابادی۔ حیات و خدمات حیدرآباد ۱۹۹۳ء
۳۳ محمد اسلم شیخپوری بڑوں کا بچپن دیوبند زمزم بکڈپو، دیوبند ۱۹۹۶ء
۳۴ مسکین حجازی اداریہ نویسی لاہور ۱۹۷۰ء
۳۵ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو دہلی ادارہ کتاب الشفاء ۲۰۰۰ء
۳۶ روشن رومانی ذرائع ابلاغ کی تحریریں حیدرآباد ۲۰۰۷ء
۳۷ نعیم الرحمن صدیقی ندوی مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب زندگی کے چند ورق لکھنؤ صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ ۲۰۰۳ء
۳۸ مقصود اقبال حیدرآباد میں کالم نگاری حیدرآباد غیر مطبوعہ ۱۹۹۱ء
مقالہ برائے ایم فل ۱۹۹۱ء

اخبار و رسائل

۱	نقوش شخصیات نمبر	ماہنامہ ادارہ فروغ اردو	لاہور	جنوری ۱۹۵۵ء
۲	نیادور عبدالماجد نمبر	ماہنامہ ارواکادمی، لکھنؤ	لکھنؤ	اپریل، مئی ۱۹۷۸ء
۳	نیادور	ماہنامہ ارواکادمی، لکھنؤ	لکھنؤ	نومبر ۲۰۰۲ء
۴	فروغ اردو، عبدالماجد نمبر	ماہنامہ ادارہ فروغ اردو	لکھنؤ	اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء
۵	چنگاری، کالم نگاری نمبر	پندرہ روزہ	دہلی	۱۹۸۴ء
۶	معارف	ماہنامہ	دہلی	فروری ۱۹۷۷ء
۷	صفا خاص نمبر 'ادب اسلامی ایک مطالعہ'	ماہنامہ	حیدرآباد	۱۹۹۶ء
۸	''سچ''	ہفتہ وار	لکھنؤ	۱۹۲۵ء، تا ۱۹۳۰ء
۹	''صدق''	ہفتہ وار	لکھنؤ	۱۹۳۴ء
۱۰	''صدق جدید''	ہفتہ وار	لکھنؤ	۱۸۵۸ء تا ۱۹۷۰ء
۱۱	''صدق جدید''	مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر	لکھنؤ	جنوری ۱۹۸۷ء
۱۲	''صدق جدید''	مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر	لکھنؤ	جنوری ۱۹۸۴ء

LANA ABDUL MAJID DARYABADI KI SAHAFATI KHIDMAAT
BY IRSHAD SUHAIL OMRI

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

(ولادت: ۱۸۹۲ء - وفات: ۱۹۷۷ء)

سبز ہے تیری عرق ریزی سے ''اردو'' کا چمن
گل بداماں ہے تیرے دم سے ''ریاض علم وفن''

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت ہشت پہلو ہیرا کے مثل ہے، جس کا ہر پہلو گوناگوں خصوصیات کا حامل
وہ ایک صاحب طرز ادیب، بہترین طنز نگار، اور بلند پایہ صحافی تھے۔ ان کے قلم نے مذہب، مشرقی ومغربی فلسفہ،
صحافت، تصوف، تفسیر اور تراجم جیسے متضاد موضوعات پر ہزاروں صفحات کا قابل فخر سرمایہ فراہم کیا ہے۔ مولانا کی مس
تصانیف کی تعداد کم وبیش ساٹھ (۶۰) ہیں۔ ان کی تصانیف اور کتابوں کی تعداد کا مقابلہ تو شاید اوروں سے بھی ہو
لیکن اتنے متضاد موضوعات پر، وہ بھی ہر کتاب سند اور حوالے کا مقام بھی حاصل کرلے، ایسا کم ہی ہوا ہے۔

مولانا دریابادی کا مطالعہ وسیع بھی تھا اور گہرا بھی۔ قدیم وجدید دونوں علوم پر نظر رکھتے تھے اور اپنی پوری
علم وفن اور ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں جب ہفتہ وار ''سچ'' اخبار کی عنانِ ادارت
اُس وقت سے وہ اپنے اخبار میں مسلسل لکھتے رہے۔ سچ اخبار بند ہونے کے بعد ہفتہ روزہ ''صدق'' پھر ''صدق جدید
ان کا اشہبِ قلم برابر دشتِ صحافت کی پُر خار وادیوں کی سیر کرتا رہا۔ اس طرح انہوں نے کم وبیش ۵۲ سال تک صح
کی خدمت کرکے ایک مخصوص طرزِ صحافت بنیاد رکھی۔ بقولِ جمیل مہدی'' وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد دوسرے
ہیں، جنہوں نے صحافت میں علمی شان اور ادیبانہ شگفتگی کے ساتھ شخصی وقار کو قائم رکھا۔''

مولانا کی تحریر میں ایک طرف مولانا محمد علی جوہر کی صحافت وصداقت، خودداری و وطن پرستی اور بے باکی وشیو
کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف اکبرالہ آبادی کی ظرافت وخوش طبعی، رنگینی وزندہ دلی، اور لذت ولطافت نظر آتی ہے
معنوں میں وہ نثر کے اکبرالہ آبادی تھے، ان کا طنز کہیں نشتر ہے، کہیں چٹکی ہے، کہیں تازیانہ اور کہیں صرف گدگدی، وہ ا
منفرد اسلوب کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی ہیں، غرض مولانا دریابادی اُردو ادب کے مینارِ نور اور اُردو صحافت کی آبرو تھے

ارشاد سہیـ

N No. 978-8192-802-5-2

PUBLISHER
DEPT. OF URDU
C. ABDUL HAKEEM COLLEGE
MELVISHARAM-632509 (T.N.)